

سلسلہ دائرہ ادبیہ نمبر ۱۰

مشرقی ترکستان

پہلے

سر آدرین سٹن کا سفر ترکستانِ شرقی، مناظر وسطِ ایشیا کا دلچسپ مرقع،
نار قدیمہ کی تحقیق و انکشاف، باقیاتِ عہدِ عتیقہ پر اجمالی نظر،

مترجمہ

سید محمود عظم فہمی ترمذی

ادبی پریس لکھنؤ میں چھپو کر

دائرہ ادبیہ نمبر ۱۰ شائع کیا

قیمت

۵۲ فصل اسم اللہ الرحمن الرحیم

مختصرہ مقدمہ

نحمدہ و نصلی علیٰ سراسولہ الکریم

اے کہ تیرا نام زیت ہر اک عنوان کی اسے کہ تیری ذات خالق پر کر انسان کی
 دیکر تیرا روح کو ہے مایہ عند بساط دل کو تیری یاد سے حاصل ہوا کہ تیرا نہ نشا
 شہر انسان فطرتاً اپنے اسلاف کے کارنامے معلوم کرنے کا آرزو مند
 ہے۔ اُسے ہمیشہ خواہش رہتی ہے کہ اپنے آبا و اجداد کے گزیرے
 ہوئے واقعات کا علم حاصل کرے اور اُسکے لیے وہ تمام ممکن قریب
 سے کام لیتا ہے۔ اُس کا یہ فطری ولولہ دو چار دس پانچ پشت تک
 جا کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنی اس حرص کو انتہا تک وسعت دے
 چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم ہر قوم میں حضرت ابوالبشر کے متعلق منت ہی اُمتان
 پاتے جو انسانی خواہش معلومات کی انتہائی معراج ہے۔

لیکن قدیم انسان صحیح معلومات حاصل کرنے کے ذرائع سے بخیر
 تھے اسلئے اُن کے اکثر واقعات پر افسانہ کا رنگ چڑھ گیا جس نے
 اُنہیں تاریخی حیثیت سے گرا دیا۔

Checked 1969.

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وانشور ان یورپ نے آثارِ قدیمہ کا محکمہ قائم کیا جس نے نہایت محنت و کوشش سے تفتیش حالات اور تلاش آثار کی۔ عہدِ عتیق کے کھنڈروں سے پرانی اشیاء، قدیم کتبے اور دیرینہ تحریریں فراہم کیں۔ پھر ان کے ذریعہ سے جو تاریخ مرتب کی گئی ہے اُس کا پایہ اعتبار درجہ یقین تک پہنچ گیا ہے۔

ہم ایشیائی ہیں، ایشیائی قوموں کے متعلق اس قسم کی سعی ہمارا فرض تھا جسے یورپ نے بہت اچھی طرح انجام دیا لیکن افسوس ہمارا بڑا حصہ یورپین زبانوں سے ناواقفیت کی بدولت ان تحقیقات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اپنی قدیم داستانوں کو وحی آسمانی سمجھ رہا ہے۔ اسلئے میں نے عزم باجزم کر لیا کہ حتی الامکان ان جدید انکشافات سے ملکِ قوم کو روشناس کراؤں۔ اس سلسلہ میں میں نے سب سے پہلے ایک فریج تصنیف کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا جو انجمن ترقی اردو کی بدولت تاریخِ مللِ قدیمہ مشرق کے نام سے شائع ہو کر اہل ملک کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے تاریخ مذکور میں قریباً مغربی ایشیا کی کل متمدن اقوام (مثلاً مصری، کلدانی، آشوری، یہودی، فنیقی، وغیرہ) کی مفصل تاریخ و مختصر جغرافیہ کے علاوہ ان کے مذہب، صنعت و حرفت، ایجادات، فنونِ لطیفہ اور

علمی کارناموں پر فصل بحث کی گئی ہے۔ اور ہر حصہ کے آخر میں
ذرائع معلومات۔ دانشوران یورپ کی محنت و جانکاہی اور کتبوں
اور تحریروں کے پڑھنے میں دشواریاں اور آخر کار استقلال کے
ساتھ اس حوصلہ فرسام کا طے کیا جانا مشرح طور پر بتایا گیا ہے۔
اس وقت جو مختصر کتاب آپ کے پیش نظر ہے یہ سر ادیل اسٹن
کے وسط ایشیا کا سفرنامہ ہے جسے محترم مصنف نے عقاب و وسط
ایشیا کے نام سے اہل ایشیا کیلئے خود فارسی میں ترجمہ کر کے ہم
لوگوں پر بے پایان احسان فرمایا ہے۔ آپ حضرات جب مقامات
سفر کی دشواریوں پر نظر ڈالیں گے تو اس ادوار العزم بہادر کے
ہمت مردانہ کی داد دیے بغیر رہ نہ سکیں گے۔

مجھے اس کتاب کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں
کیونکہ فاضل مصنف نے اپنے دیباچہ میں خود مشرح طور پر بہت
کچھ بیان فرمادیا ہے۔ البتہ یہ عرض کر دینا میرا اخلاقی فرض ہے
کہ صاحب ممدوح کی مشقیات کے متعلق یہ گہری دلچسپان ہم
باشندگان ایشیا کیلئے انتہا ممنونیت کا باعث ہیں۔ ہم اپنے
مخلصانہ شکریے پیشکش کرتے ہوئے یہ امید رکھتے ہیں کہ آئندہ
بھی صاحب موصوف اپنی بیش بہا ساعی کے نتائج سے

اہل مشرق کو محروم نہ رکھیں گے۔

احسان و ارموشی ہوگی اگر میں ان حضرات کا شکریہ نہ ادا کر دوں
جنھوں نے اس ترجمہ میں ہر قسم کی امداد ہم پہنچائی۔ سب سے
پہلے میں اپنے معظم و محترم جناب مولانا محمد حسین صاحب محوئی
لکھنوی کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ صاحب موصوف نے مجھے
اس ترجمہ کی طرف متوجہ کیا پھر ترجمہ کو اصل سے مقابلہ کر کے
ہر طرح ترمیم و اصلاح سے ممنون فرمایا۔ اسکے بعد اپنے عزیز
ترین دوست مولوی محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ لکھنؤ کا
شکر گزار ہوں جنھوں نے اسکی طبع و اشاعت میں نہایت دلچسپی
کا اظہار فرمایا اور دائرہ ادبیہ کی طرف سے اس ناچیز ترجمہ کو شائع
کیا۔

سید محمود اعظم فہمی ترمذی

۷ مارچ ۱۹۲۲ء

دیباچہ

وسط ایشیا میں اپنے دوسرے سفر کی تحقیقات کے متعلق ہیں نے
 رائیل جغرافیہ کیل سوسائٹی لندن میں سن ۱۸۹۷ء میں جو لیکچر دیا تھا یہ
 چھوٹی سی کتاب اس کا ترجمہ ہے۔ میں یہاں بعض اُن اسباب کا
 بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے اس ترجمہ اور
 اشاعت کی رغبت دلائی۔ جب سے انجن مذکور کے اخبار میں مجل
 طور پر میرے سفر کی تفصیل شائع ہوئی اور اسکے بعد میں نے خود
 تمام واقعات کو مفصل طور پر دو ضخیم جلدوں میں لکھا جن کا نام
 ”ڈائنز آف وزیرت کتائی“ ہے اس وقت سے برابر مجھے یہ افسوس
 رہا کہ ہندوستان، ترکستان، ایران، اور سرحد افغانستان میں
 میرے بعض دوست جو زبان انگریزی سے نا آشنا ہیں وہ میرے سفر
 کے مقاصد و نتائج معلوم کرنے سے بالکل محروم رہ جائیں گے
 اس لیے یعنی دشت خطا کے کھنڈر۔ یہ کتاب سراویل آسٹن کی تصنیف ہو
 جسے میکملن کمپنی نے لندن میں طبع کر دیا ہے ۱۲

حالانکہ انھوں نے میرے کاموں میں نہایت دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا اور انھیں کی دوستانہ امداد تھی کہ میں اپنے تیسرے سفر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۶ء تک میں بھی جدید انکشافات کے متعلق کامیاب ہوا۔ اسکے علاوہ اور حضرات کو بھی آئندہ سفر کے متعلق متوجہ کرنا مقصود تھا جو میرے پیش نظر ہے اور غالباً بہت اہم ہوگا۔ لہذا اسکے رفع اور اسکے حصول کے لئے میں نے مناسب سلجھا کہ کچھ نہ کچھ میرے حالات سفر اور اسکے نتائج فارسی میں ترجمہ ہو جائیں خصوصاً یہ امر میری دلی مسرت کا باعث ہوگا کہ مختصر طور پر میرے سفر اور وسط ایشیا کے انکشاف کی تشریح اور بعض اشیائے قدیمہ کا ذکر جنھیں میں نے حاصل کیا ہے ایرانی زبان میں لکھا جائے، کیونکہ میری تحقیقات کے مطابق محقق اور مدلل ہو چکا ہے کہ ایجاد تاریخ کی ابتدا سے تمام ایشیا کی عقل و تہذیب و صنعت کا بزرگترین مرکز ایران رہا ہے۔ بیابان ہاے وسط ایشیا کے کھنڈر دن سے میں نے جو اشیائے قدیمہ حاصل کئے وہ اس بات کی سب سے بہتر دلیل ہیں کہ قدیم ایران کے علوم و فنون بہت اعلیٰ مرتبہ پر مالک

۱۵ یعنی ناآشنایان زبان انگریزی کی محرومی رفع کرنے کیلئے ۱۲

۱۵ یعنی دیگر حضرات کی حصول توجہ کیلئے ۱۲

چین میں شایع و نفاذ پذیر ہو چکے ہیں۔ اگر ایران کے دانش پرور
 حسیات موید نہوتے تو ہندوستان کا فلسفہ اور یونان کی صنعت
 اقصائے مشرق میں کبھی جلوہ گر نہ ہو سکتی۔ لازمی طور پر مجھے یہ بھی
 کہنا چاہئے کہ ایران قدیم (جو ایک مدت سے اپنی طرف بٹھے
 متوجہ کئے ہوئے ہے) ایران جدید سے بہت بڑا اور وسیع تھا۔
 اُس زمانہ میں اسکے حدود مشرق کی طرف اطراف کوہستان
 ہند و کش و دریاے سندھ تک اور شمال کی طرف سر دریا یعنی
 نہر سیحون تک پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان ممالک میں ایران
 کی شیریں زبان اب تک ہر منور کی طرح رونق افروز ہے شہابی
 ہندوستان کے نواح میں بھی (اُن مقتدر شہنشاہوں کی
 ہر لغزیری کی وجہ سے جو وسط ایشیا سے آکر ایرانی علوم کا مرکز
 اور تہذیب و تمدن سے متصف تھے) ایرانی زبان آج تک
 علمی زبان گنی جاتی ہے۔ اسلئے یہ مسلم ہے کہ بہت وسیع و سبیط
 ممالک میں اس کتاب کے طالب پیدا ہو سکیں گے۔ لیکن
 میری یہ آرزو ہے کہ ہر جگہ سے زیادہ ملک افغانستان، بلخ
 بدخشان، اور کوہستان ہند و کش کے نواح میں مقبول ہو (جو
 صدیوں تک ایرانی، ہندوستانی اور یونانی تہذیب کے پرتو

سے منور رہے ہیں۔

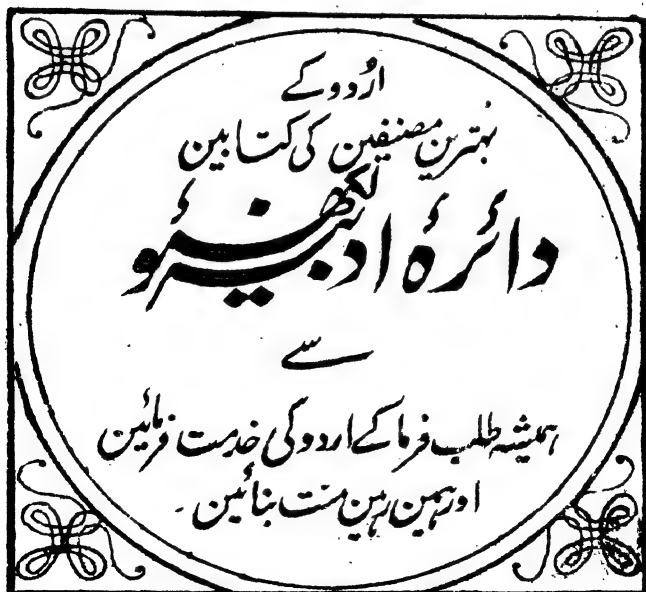
اگرچہ یہ ممالک ہمیشہ ارباب تاریخ کی توجہ کا مرکز رہے ہیں لیکن ان میں آثارِ عقیدہ کے انکشافات کے لئے آج تک پوری کوشش نہیں کی گئی۔ مجھے حسرت ہے کہ اگر قیمت مدد کرے تو ان جڑ بخش ممالک کو جلد سے جلد دیکھوں جنہیں دیکھنے کی ابتداء جوانی سے آرزو ہے۔

اب میرے ذمہ آخری فرض یہ ہے کہ اپنے دوستانہ سکریے تین اصحاب کو پیشکش کروں۔ پہلے جناب آقا محمد ابراہیم ابراہمی جنہوں نے سلیس عبارت لکھنے میں حتی الامکان بہت کوشش کی۔ دوسرے جناب مولوی ظفر حسن صاحب جنہوں نے علم جغرافیہ و آثارِ عقیدہ کے اصطلاحات کی توضیح و تشریح میں امداد و ستانہ کے علاوہ اس کتاب کی طبع و اشاعت میں بھی سعیِ بلیغ کی ہے۔ تیسرے حضرت مستطاب اجل عالی آقائے سردار گل محمد خان سفیر دولت علیہ خداداد افغانستان متینہ ہندوستان جنہوں نے کمال شفقت سے اپنا وقت عزیز صرف کر کے طباعت سے قبل اس کتاب کو ملاحظہ کیا اور عبارات و کلمات غیر مروجہ کی اصلاح فرما کر

مجھے مدتِ العمر کے لئے رہینِ احسان بنالیا ۔

اوریل آسٹن

۷ مارچ ۱۹۲۱ء
مطابق ۲۷ جنوری الثانی ۱۳۳۹ھ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلہ (مطابق سلسلہ ہجری) میں چینی ترکستان کے سفرے
 واپس آکر مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اگر فرصت ملے تو دوبارہ انھیں
 ممالک میں شل سابق آثار قدیمہ کی تحقیقات کروں۔ کیونکہ مجھے
 قومی امید تھی کہ اُن جنگلوں کے کھنڈروں سے بعض پرانی چیزیں
 اور یادگارین حاصل ہو سکتی ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ قدیم زمانہ
 میں ہندوستانی، چینی، اور یونانی تہذیب دریاے تارم کے
 اُن مرغزاروں میں موجود تھی۔ جس کا میری خوش قسمتی سے میرے
 پہلے ہی سفر کے دوران تحقیقات میں کسی قدر اندازہ ہو چکا تھا۔
 لیکن مجھے پہلے سفر میں تحقیق و تدقیق کا جو موقع ہاتھ آ گیا تھا۔
 دوسرے سفر کے لئے فرصت نہ پائی۔ بیان تک کہ سلسلہ (مطابق
 سلسلہ ہجری) میں میں نے حکومت ہند کی خدمت میں ایک تفصیلی
 عرضداشت اس مضمون کی بھیجی کہ میرے دوسرے سفر کے لئے مجھے
 امداد بہم پہنچائی جائے تاکہ میں دوبارہ بیابان خشک کاہن کے کھنڈروں

میں پہونچکر وہاں سے مشرق کی طرف لون پور و سبہ اسکندریہ تک پہونچ جاؤں۔ چونکہ جناب لاڈ کر زن (دو ایسٹری) کو اس فن سے بہت زیادہ انس تھا اسلئے ان کی توجہ اور ان دوستوں کی مدد سے جو یہ جانتے تھے کہ یہ انکشافات علم تاریخ کی ترقی اور ہندوستان کے آثار قدیمہ کے لئے مفید ہونگے۔ ۹۵۰ھ (مطابق ۱۵۴۲ء ہجری) میں میری درخواست حکومت ہندوستان نے منظور کر لی میں نے بہت کوشش کی کہ اسی سال روانہ ہو جاؤں۔ لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ آخر کار ماہ اپریل ۱۵۴۷ء (مطابق ۱۵۴۲ء ہجری) میں کشمیر سے روانہ ہوا۔ حالانکہ ۶ ماہ تک دو ضخیم کتابوں موسوم بہ خن قدیم کی تیاری کا کام کر چکا۔ اس مرتبہ چینی ترکستان جانے کے لئے میں نے دوسری راہ انتخاب کی جو صرف طالبان علم جغرافیہ کیلئے بہتر تھی اور اس زمانہ میں کوئی یورپین اس راہ سے گزر نہ سکتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ پشاور و سرحد ہندوستان سے یا غستان، سوات، دیر میں گزر کر جہرال ہوتا ہوا بر و غیل کی مرتفع زمین کو عبور کر کے دادی چیون اور پامیر افغانستان میں پہونچ جاؤں۔

اعلیٰ حضرت امیر عبدالرحمن خان امیر افغانستان کی طرف سے بھی اجازت ملگئی کہ ملک افغانستان کے ایک حصہ کی سیاحت

کر لوں (جسے کوئی پور وپین سرحد بندی پامیر کے وقت سے نہ دیکھ سکا تھا) اعلیٰ حضرت امیر افغانستان کی یہ عنایت نہایت شکرگزاری کا باعث ہوئی۔ مجھے اتنے جلد اجازت مل جانے کی امید نہ تھی۔ اب نقطہ یہ مشکل باقی رہ گئی کہ درہ لواری جو ۱۰۲۰۰ فٹ بلند اور برف میں پھان ہے اسے مع سامان عبور کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ بہر حال ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء (مطابق ۱۲۷۱ھ ہجری) کو قلعہ چقرہ سوٹ سے روانہ ہوا۔ یہ قلعہ بہت مشہور ہے، کیونکہ قبائل آنولائی شوٹرز کے زمانہ میں یہاں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ اس سفر میں میرے ساتھ میرے دو مددگار بھی تھے۔ ایک شخص رائے رام سنگھ نامی تھا جو بہت عقلمند اور پہلے سفر میں بھی میرے ہمراہ رہ چکا تھا دوسرا ہمارا ہی نایک رام سنگھ تھا۔ جو فوج میں محاسب اور نایک کا عہدہ رکھتا تھا۔ مصوری و نقشہ کشی وغیرہ میں اسکی امداد بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان کے علاوہ ایک اردلی محمد جو دیار قندی نامی تھا اس پیر مرد کی وفاداری کے متعلق صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ اس نے ہم سے ملنے کیلئے فوق العادت ہمداری کے ساتھ خطرناک اور برفستانی درون کو عبور کیا اگرچہ اس راہ میں برف کے ایک ٹکڑے نے پہاڑ سے لڑھک کر اس کے چہرہ پر ہویں کو ہلاک کر دیا

لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ محفوظ رہا اور ہم سے مل گیا۔ ایک ہندوستانی مسلمان باورچی بھی ساتھ تھا۔ رائے صاحب کے ہمراہ بھی جسونت سنگہ نامی پستہ قداور مضبوط ملازم تھا۔ پہلے سفر میں رائے صاحب کا کھانا یہی پکاتا تھا۔ ہندوستانی نوکر دن میں اس کی طرح قابل اعتماد اور مہذب آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ غرض یہ کہ اس سفر کا صرف مقصد نہ تھا کہ ہم دور و دراز ملکوں میں پہنچ جائیں بلکہ قدیم حالات کی آگاہی حاصل کرنا لازمی تھا اسلئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ میں پہلے سرحد کی اُن وادیوں میں جاؤں جہاں سے دو ہزار برس پہلے سکندر کی فوج گزری تھی۔ وہاں بودھ کے زمانہ کے کھنڈر قابل ملاحظہ تھے نیز دیر کی راہ میں رہنے والی قوموں کے نسب اصلیت کی تحقیق بھی نہایت دلچسپ تھی۔

مختصر یہ کہ ماہ مئی کی تیسری تاریخ ہم درہ لوہارہ کے متصل پہنچے اور اس وقت معام ہو کہ اس درہ کی جو کیفیت ہم نے سنی تھی وہ مبالغہ سے خالی تھی۔ آفتاب نکلنے سے پہلے اُن ہندوستانی تنگناؤں کو ہم نے سلامتی کے ساتھ عبور کر لیا اور بجلت نہر حیرال کی عمیق دادی کی راہ سے قلعہ دروش میں پہنچ گئے۔ دوسرے دن تیرہی کے ساتھ نہر کے کنارے کنارے بڑے بڑے پتھر دن پر سے

گزرتے ہوئے دارالسلطنت حیرال من پہونچے جو کوہستان کے دامن
میں ایک چھوٹا سا سنہو زار ہے۔ چند روزہ قیام کے زمانہ میں ان
کے باشندوں کے نسل کی تحقیق کا خوب موقع مل گیا۔ قوم داروکا
ایک بڑا حصہ حیرال میں موجود ہے۔ اس نسل کی قدامت اربا تارخ
و مورخین علم انساب کی خاص توجہ کا باعث ہو گئی ہے۔

نسل و نسب کی تحقیق کے سلسلہ میں جن لوگوں کو میں نے دیکھا
وہ زیادہ تر کوہستان ہندوکش کے فارسی بولنے والے باشندے
اور اہل کافرستان تھے۔

اسکے بعد میں نے چند ضروری کاموں کی وجہ سے مجبوراً دریائے
جیخون اور بام دنیا (پامیر) کی طرف سفر کیا۔ باوجودیکہ ہم دریائے
یارخون اور مستج کے درمیان بے عجلت سفر کر رہے تھے پھر بھی جو
صحیح اطلاعات مجھے پہونچیں ان کے مطابق دوران راہ میں میں نے
بووہ کے ابتدائی زمانہ کے بعض صاف شدہ پتھر اور اسلام سے
قبل کے قلعے دیکھے اور سمجھ بیا کہ ان دو چینی مورخوں کی اطلاعات
جو وسط ایشیا کی تاریخ و جغرافیہ میں رہنما تھیں صحیح ہیں۔ اس سے
پہلے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ۹۳۹ء مطابق ۳۳۳ھ ہجری میں ایک
چینی فوج جس نے کاشغر و پامیر سے آکر نام ملک یاسین و گلگت مقبوضہ

اہلِ بہت کو ناخست و تاراج کیا تھا وہ اسی راہ سے گزری ہوگی جو
 بردغیل و دارکوٹ کے درون کے مابین واقع ہے۔ مجھے بہت
 شوق تھا کہ جس راہ سے اس فوج نے سفر کیا ہے میں اس راہ کے
 علامات معلوم کروں۔ کیونکہ تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی فوج
 اس قدر انتظام و سامان کے ساتھ پامیر و ہندوکش کے دشوار گزار
 پہاڑوں سے گزری ہوگی۔ اس ارادہ کی وجہ سے ہم لوگ درہ دارکوٹ
 کی طرف روانہ ہوئے جو ۱۵۴۰۰ فٹ بلند ہے۔ چونکہ تمام راہ سب خاؤ
 برف سے پُر تھی اسلئے نو گھنٹہ کی محنت و مشقت کے بعد ہم درہ کے
 اوپر پہنچے۔ کسی کو یہ گمان نہ تھا کہ ہم درہ کے اوپر پہنچ جائیں گے
 یہاں تک کہ ہمارے رہنا بھی جو مستح و دواخی کے لوگ تھے ہی کہتے
 تھے کہ جاڑ دن کے زمانہ میں اس درہ کے اوپر جانا ناممکن ہے
 تھوڑی دیر تک اُسے دیکھنے اور تحقیقات کرنے کے بعد مجھے یقین
 ہو گیا کہ اس راہ اور درہ کے متعلق کا مہنہ جی کی تمام اطلاعات
 صحیح ہیں۔ جس وقت میں نے اس برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی
 پر کھڑے ہو کر دایسی یا سین کی طرف نظر کی جو دہان سے ۶۰۰۰
 فٹ نشیب میں تھی تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہاں اس
 بہادر جنرل کو رین کی کوئی یادگار نہیں بنائی گئی جس نے ہزاروں

سپاہیوں کے ساتھ اس دشوار گزار کوہستان کو عبور کیا تھا
 مختصر یہ کہ ہم ۱۹ مئی کو کوہستان پہنچے۔ دلکش سے گزر گئے جسکے
 سب سے نیچے پہاڑ کا نام بردغیل ہے۔ اور جو ۱۲۴۰۰ فٹ بلند
 ہے۔ چونکہ اُس سال معمول سے زیادہ بر فبارشی ہوئی تھی اسلئے
 تمام راہ برت سے پُر اور اسقدر دشوار گزار تھی کہ اگر افغانستان
 سے مہینہ دو نہ پہنچتی تو ہم اپنے سامان اور بار برداری کو اس
 درہ سے نہ لیجا سکتے۔ اسوقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی
 جب میں نے دیکھا کہ بن بنج دریائے جیخون کے قریب ہوں وہ دلکش میز
 کہ آغاز جوانی میں جسکے دیکھنے کی حسرت تھی لیکن اور فرنگیوں
 کی طرح اب تک یہ آرزو پوری نہ ہو سکی تھی۔ آگے سرحد چین دلیمر
 تک سفر کے لئے تمام سامان و ضروریات بحکم اعلیٰ حضرت امیر
 افغانستان امیر عبدالرحمن خان مہینہ تیار ملائیر اعلیٰ حضرت نے کرنل
 شیرین دل خان کو بھی سرحد پر ہمارے انتظام کیلئے بھیجا تھا
 جو افواج بدخشان وغیرہ کے سپہ سالار تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے
 تو صاحب موصوف ہم سے نہایت مہربانی کے ساتھ ملے۔ بخدا
 کرنل شیرین دل خان کا وجود اسوقت ہمارے لئے ایک بڑی
 نعمت تھا ہم نے انکی صحبت کو غنیمت سمجھ کر غرض سفر اقامت سے

بدل دیا۔ یہ بہادر اور خلیجی انسان نہایت خطرناک نہ مانے میں امیر
عبدالرحمن خان کے جلوس کے قبل وبعد سخت لڑائیوں کا
ہو۔ انھوں نے بدخشان اور بخارا کے آثار قدیمہ کے متعلق ہمیں
صرف مفید اطلاعات ہی ہم نہ پہنچائیں بلکہ یہ ذات خود ایک بہت
دلچسپ تاریخ کا مجسمہ تھے۔ سب سے زیادہ فریداران کا بیان
تھا کہ انھوں نے آغاز جوانی میں اس نام کرنے کے لئے باشندگان
وسطایشیا کی رسم کے مطابق باغیوں کے سروں سے کٹی مینار
بنائے ہیں۔

الغرض علی الصباح ۳ بجے کرنل صاحب رخصت ہو کر
روانہ ہوا اور صاحب موصوف نے اس خیال سے یہیں قیام
کیا کہ کہیں مزدور ہمارا سامان پھیک کر ادھی راہ سے بھاگ نہ
جائیں۔ حقیقتاً اگر مزدور روئے کو کرنل صاحب کا خوف نہوتا تو وہ
ہمارا اسباب ہرگز نہ اٹھاتے۔

جیون کے کنارے کی راہ بہت تکلیف دہ تھی کیونکہ جاڑوں
میں دریا کے طغیانی کی وجہ سے راہ بند ہو جاتی ہے اور گرمیوں
میں بھی برت کے نیچے دکھائی نہیں دیتی۔ اس کو ہستان میں
ہمارے بدخشانی ٹٹوون کی جست و خیز بہت جبرست انگیز تھی۔

صرف افغانی سپاہیوں کی مدد و رہنمائی کی وجہ سے ہمارا سامان
 دریا میں گرنے سے محفوظ رہا۔ ہم ایک دن کریمزین رہے۔
 اگرچہ بہت سخت سردی تھی پھر بھی ہم نے نہریا میر اور اس مقام
 کی سیر کی جان پانی کی دو شاخیں ہو کر سبزہ زار سے آتی ہیں۔
 ایک شاخ مرغاب و نہر مذکور کی طرف چلی جاتی ہے اور دوسری
 نہر پنجہ کی طرف ۲۷ میس کو ہم درہ و خچر کے دامن میں پہنچے
 جو ۱۲۲۰ فٹ بلند ہے۔ لارڈ کرزن لکھتے ہیں کہ دریاے جیون
 کا منبع یہیں ہے اور میرے خیال میں بھی یہ صحیح ہے۔ اس درے
 اور سرحد افغانستان و چین سے جس روز ہم گزرے ہیں اس
 دن ہم نے جو محنت و تکلیف اٹھائی وہ تحریر میں نہیں آ سکتی
 و خچر کا راستہ برف سے پُر تھا۔ صبح کے وقت اگرچہ ہوا بہت
 ٹھنڈی تھی لیکن برف کی سطح اس قدر نرم تھی کہ اس پر سے
 سوار ہو کر گزرنا ممکن نہ تھا۔ سخت کوشش اور جدوجہد کے
 بعد ہم آخر کار چین کی سرحد پر پہنچے اور ایک ایسے گاؤں
 میں جان جلائی کی کڑیاں اہل سکتی تھیں کھڑے۔
 دوسرے روز صرف یہی ہوا کہ ہم پامیر و تغد مباحش سے
 گزر کر اس بہت قدیم راہ پر پہنچ گئے جس سے کم ہونگ پانی

سلسلہء مطابق سلسلہ میں ہندوستان کے طویل سفر کے بعد پٹیا تھا۔ اس جگہ ایک قلعہ کے چہرہ دن کا ملبہ نظر آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک چین کے بادشاہ کی لڑکی اس قلعہ میں قید کی گئی تھی۔ کوہ کرکرم (یعنی خانہ رومی کا برج) کے اوپر جو برج اور فصیل میں نے دیکھی وہ دریا سے تغد سباش سے ۵۰ فٹ بلند ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ ہیون سانگ چینی کے زمانہ میں ویران ہو چکا تھا۔ ان وادیوں کی ہوا اس قدر خشک ہے کہ پرانی دیواریں جو صرف ایٹون کی بنی ہوئی ہیں اب بھی نظر آ جاتی ہیں۔

شکر غام سے کا شغرتک ایک سو انسی میل کی مسافت ہم نے ۶ روز میں طے کی اگرچہ برن کے گچھل جانے اور سیلاب کیوجہ بہت دشواریاں پیش آئیں۔ ۸ جون کو ساٹھ میل سواری پر سفر کرنے کے بعد رات کے وقت کا شغر پہنچ گئے۔ جو وقت ہم وہاں پہنچے ہیں گرد و غبار کا ایک طوفان برپا تھا۔ میرے پرانے دوست جناب مکارٹنی صاحب سفیر اعظم حضرت بادشاہ انگلستان مقیم کا شغرتک نہایت محبت و مہربانی کے ساتھ میری پذیرائی کی۔ میں دو ہفتہ تک انکے ساتھ رہا اگرچہ کاموں کی

زیادتی کی وجہ سے صبح سے شام تک مشغول رہتا تھا پھر بھی یہ مانہ
 بہت اچھا گزرا۔ مکارٹنی صاحب نے علاوہ اسکے کہ میرے
 سفر کے لئے حکومت چین سے اطمینان حاصل کیا ایک بہت قابل
 محرر سے بھی میرا تعارف کرا دیا۔ یہ شخص چیانگ سوئی نامی اوچین
 کا باشندہ تھا۔ اس چینی عالم کی خدمات میرے مقاصد کیلئے نہایت
 ضروری تھیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میری خوش قسمتی تھی جو
 ایسے شخص سے ملاقات ہو گئی۔ کیونکہ جب تک میں چینی زبان
 سے کچھ کچھ آشناء ہو گیا اس وقت تک زمانہ اسف میں میرا منشی
 میرا معلم اور تحقیقات میں میرا یار و مددگار رہا۔ اسکی دلچسپ
 صحبت اُس محنت و تنہائی کے زمانہ میں میرے لئے بڑی نعمت
 تھی۔ یہ نسبتہ قدر لاغر اندام، اور سفر کی محنت و مشقت سے بالکل
 بے پروا تھا۔ قدیم لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی دلچسپی کے
 علاوہ یہ میرا باوقار رفیق انتہا درجہ کا مروجہ شناس اور ظریف تھا
 اسکی جدائی کے وقت سے اب تک ہمیشہ مجھے یہ آرزو رہی ہے کہ
 دوبارہ اسکے دیدار سے فائدہ اٹھاؤں۔

غرض ۲۲ جون کو ختن سے کاشغر کا قصد کیا۔ یارقندہ میں
 قافلہ کی تکمیل (مزدور و بار برداری وغیرہ) کیلئے چند روز

قیام کر کے کوہستان کونلون کی طرف روانہ ہوا جو کاکیار کے قریب اسکی مشرقی سمت میں واقع ہے۔ وہاں بھی دو ہفتہ تک بہت زیادہ کام کیا۔ تحریری کام کے علاوہ اہل یورپ کے لئے باشندگان پنجپو کے حالات و نسل کی تحقیقات میں مصروف رہا۔ جس غیر معروضی راہ سے آخر جولائی میں کوہ پامیر ہو کر ختن جانے کا اتفاق ہوا اسکی تشریح بیکار اور بیان لکھنا غیر ضروری ہے۔

پہلے سفر کے پانچ سال بعد پھر ان فرحت بخش سفر گزار و زمین آنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے نہایت مسرت کے ساتھ فوراً احکام چین سے ملاقات کر کے ترک دوستوں کے ذریعہ سے اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے تحقیقات شروع کی۔ صرف چار ہفتہ کی مدت میں سلسلہ کوہستان کونلون کا معائنہ ضروری تھا جو ختن کے جنوب میں واقع ہے تاکہ سلسلہ (مطابق سلسلہ) کی تحقیقات میں اضافہ ہو جائے نیز ان برف کے غاروں کے تفصیلی حالات لکھوں جو ان سے نہریوز نکاش نکلی ہے۔ اولو غا ندوان کی بلائی راہ اور درہ برنجیک سے جسے سلسلہ مطابق سلسلہ بھری میں میں نے دریافت کیا تھا، آگے جا کر تقریباً نصف ماہ اگست کو وادی نساین پہنچ گیا۔ اور بہت جلد ان بڑے بڑے

برف زارون کا نقشہ کھینچنے میں مشغول ہو گیا جو کہ کونلون اور اس چھوٹے سلسلہ کے مشرق میں واقع ہیں۔ وہاں ہین ان بڑے بڑے پتھروں کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی جو سردی کی شدت سے ٹوٹ گئے تھے۔ جس جگہ سے ہم اوپر جا رہے تھے وہ ۱۴۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند تھی اور تمام ٹوٹے ہوئے پتھر اس طرح ڈھیر اور جمع تھے کہ گویا پرانے زمانہ کی دیووں نے وہاں انکا خرمن بنایا ہے اور چھوٹے چھوٹے پتھر ہیاڈ کے دامن سے برف زارون کی سطح پر کئی میل تک ایسے معلوم نے تھے گویا ایک دریا تھا اور اب اس میں حجریت پیدا ہو گئی ہے۔ ان برف زارون کی برف بہت تیزی سے گھل رہی تھی اور اس عمیق وادی کا سیلاب ہمارے لئے بہت تکلیف دہ بلکہ خطرناک تھا۔ کاش ہماری یہ تکلیف انھیں قدرتی موانع تک منحصر رہتی اور دوسرے اسباب کا ہمیں اطمینان ہوتا لیکن افسوس کہ اسکے علاوہ خصوصاً اجناس خوراک باربراری وغیرہ کی طرف سے بھی ہمیں بہت تشویش تھی۔ اس تمام کو ہستان میں ہمارا مایہ امید فقط ایک چھوٹا سا گائون تھا جس کی مردم شماری دو سو آدمیوں سے بھی کم تھی اور وہاں کے باشندے خون کے شہر بدر کیے ہوئے مجرم تھے جو اس برفستان ہی میں تار مار رہے تھے

سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ انھیں اس کا بھی خوف تھا کہ کہیں ہم
اُن سے وہ غیر معروف راستہ بتانے کا کام نہ لیں جو کہ کوہستان
کونلون کے درمیان میں واقع ہے اور تقریباً ۵ سال قبل حاجی
حبیب اللہ خان رئیس خٹن کے زمانہ حکومت میں اسی راہ سے
لداخ تک آمد و رفت تھی اور اب اس کا کوئی نشان نہیں ملتا
حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب فراہم ہو گئے کہ ہم وادی پیشیہ
کے نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں خصوصاً دریا سے یوز نکاش
کے جنونی کوہستان میں بہت مفید باتیں معلوم ہوئیں اور یقین
ہو گیا کہ یوز نکاش کے منبع تک یہوینچے سے مشرق کی طرف سے پہنچا جائے
خلاصہ یہ کہ ۹ ستمبر کو خٹن سے واپس آ کر ہم نے سفر کے اہتمام
اور اُن خبروں کے ملاحظہ میں جنھیں اور لوگ ڈھونڈ کر لائے تھے چند روز
بسر کئے اسکے بعد شمالی و مشرقی بایان کی طرف چلے اس جنگل میں
راوک استوپا کے اسطر و پیران مکانوں کے آثار اور کھنڈر دیکھ کر
معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں یہاں آبادی بھی جب اس وسیع بایان میں جو شمالی
ہنگویہ کے کنائے اوطالمی کے نام سے موسوم ہے تلاش کی تو شکستہ
کوزپے اور ٹوٹی ہوئی اٹھین بہت کثرت سے ملیں جن سے ظاہر
ہوا کہ پہلے یہ ریگستان کئی میل تک آباد تھا اور صدیوں سے

دیر آن ہو کر برباد پڑا ہے۔ نیر چند گچ کے تختے زمین کے نیچے سے ہاتھ آئے جو کسی زمانہ میں زینت کیلئے بتخانہ کی دیوار میں نصب تھے اور غالباً پانچویں یا چھٹی صدی مسیح کے ہونگے۔

جو چیزیں یہاں حاصل کیں وہ بہت دلچسپ تھیں کیونکہ ان سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ تاتی کی طرح یہ مقامات ہوا اور انسان کی دستبرد سے تباہ ہو گئے ہیں لیکن اب بھی زمین کے نیچے پرانی چیزیں باقی ہیں جو انسانوں کی شرارت اور تیز ہواؤں کے اثر سے بچ گئی ہیں۔ دوسری چیز سنہرے آلات کی کثرت تھی اور یہ میرے اس قوائے کی تائید تھی جو میں نے کئی سال پہلے ورق طلا کی حقیقت میں بیان کیا تھا کہ حن کی خاک چھانسنے سے توکان کا پائخت حاصل ہو سکتا ہے۔ ہنگو یہ تاتی سے آگے چل کر ہم چند کھنڈر دیکھے ایک بھوئے سے مجموعہ میں پہونچے یہ کھنڈر ہمیں ان قدیم عمارتوں کی تباہی کا پتہ بنا رہے تھے جو رگستان اور مزد و مد زمین کے درمیانی جنگل میں واقع تھیں ایک دہاتی نے خدا ایک کے کھنڈر ولسے چند نوشتے ڈھونڈے تھے میں نے وہاں تک لیچلتے کیلئے اسے انعام دینے کا وعدہ کیا۔ جب میں وہاں پہونچا تو بہت ناامید ہوا کہ کیونکہ سوکے شکستہ تختوں کے اور کوئی چیز اس رگستان میں نظر نہ آئی

لیکن تھوڑی سی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں بودہ کے زمانہ کا بتخانہ تھا اور بہت سے نوشتے ہمارے ہاتھ لگے۔ اگرچہ اور آدمیوں نے خزانہ کی تلاش میں بہت کاوش کی لیکن سوائے اُن چیزوں کے جو زائرین وہاں چھوڑ گئے تھے اور کچھ حاصل نہوا۔ ان کے علاوہ ہم نے چینی، سنسکرت، اور تبتی زبان کے اوراق پائے۔ بعض اوراق اور تختے ایسے بھی ہاتھ آئے جو نامعلوم تبتی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ ان نوشتوں کی عبارتیں زیادہ تر بودہ کی مذہبی کتابوں کی نقل تھیں۔ زیادہ متشکع کے تختے ایسے بھی دیکھے جو زینت کیلئے بتخانہ کی دیواروں پر نصب کئے گئے تھے۔ دوسرے بتخانہ میں چند ایسے چینی سکے جو زائرین وہاں چھوڑ گئے تھے ملجانے سے معلوم ہوا کہ یہ کھنڈر آٹھویں صدی مسیح کے ہونگے۔ یہاں دس دن طلوع آفتاب سے غروب تک باوجود سخت گرمی اور گرد و غبار کے ہم نے مع عمدہ بتخانہ اور اسکے متعلقہ مکانات صاف کرنے میں پوری محنت سے کام لیا۔

کر یا اس رگستان میں سب اچھا سبزہ زار اور چارچان سے تقریباً ۳ میل مشرقی سمت میں واقع ہے۔ اس ملک کے

اونٹ بہت مشہور ہیں۔ ہم نے آزمائش اور رفتار کا خوب اندازہ کرنے کے بعد سات اونٹ خریدے جو ہماری بار برداری کا اچھا ذریعہ ثابت ہوئے۔ قافلہ کا تمام سامان و ذخیرہ ان سات اونٹوں اور بار برداری کے چار ٹیٹوں پر لاداجاتا تھا۔ لیکن بعض موقع پر اشیائے قدمیہ مزدوروں کا سامان اور پانی وغیرہ ڈھونے کے لئے زیادہ بار برداری کرنا یہ پر بھی لینے کی ضرورت پیش آئی۔ اس قسم کے سفروں میں اکثر اوقات سامان خورد و نوش اور بار برداری بالکل غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ان سات اونٹوں نے جھین میں نے کرنا سے خریدا تھا بہت اچھا کام دیا۔ سفر کی سختیوں میں بہت بڑبار اور دو سال کی مسافت کے بعد بھی اس قدر مرنے کا زہ مجھے کہ ہندوستان کی واپسی سے پہلے جب میں نے انھیں فروخت کیا تو اصلی قیمت کے مقابلہ میں ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ فائدہ ہوا اگرچہ یہ فائدہ میرے لئے تھا بلکہ حکومت ہندوستان کے لئے تھا۔

۱۳ راکتو بکونیا پہونچے جو یہاں کا آخری اور چھوٹا سا سفر اول مشرق کی طرف واقع ہے وہاں تیسری صدی عیسوی کے کھنڈ

نھے۔ بین بعجلت اُن کھنڈرون میں پہنچ کر تحقیقات و تلاش
 میں مصروف ہو گیا جہاں سے پانچ سال پہلے اہم چیزیں حاصل
 کر چکا تھا۔ مصمم ارادہ تھا کہ اس سفر میں اتنے ہی مزدور ساتھ
 لوں کہ جنکے لئے کافی پانی ہم پہنچا سکوں۔ بہو کہ ہمارا پُرانا
 داروغہ ابراہیم بیگ وہاں کافی رسوخ رکھتا تھا اسلئے ہم نے
 صرف ایک روزہ قیام میں ۵۰ مزدور، ضرورت سے زیادہ
 اونٹ، اور اس قدر سامان خورد و نوش جو چار ہفتے کیلئے کافی
 ہو سکے جمع کر لیا۔ ہم تین دن تک دریائے نیا کے کنارے سرسبز
 جنگل میں چلتے رہے۔ ہم نے جو آخری آباد قریہ دیکھا وہ حضرت
 امام جعفر صادق کا مزار تھا۔ اور وہیں دریائے نیا کا پانی زمین
 میں ضرب ہو جاتا تھا۔ دونوں راہ طے کرنے کے بعد اُن ریت
 لے ٹیلوں تک پہنچ گئے جو اس اُچار گانوں کے وسط میں
 واقع ہیں اُٹائے راہ میں بعض ایسے کھنڈ درن اور خشکیوں
 والے درختوں کے کنارے سے گزرا جنہیں میں نے پہلے سفر میں
 نہ دیکھا تھا۔ دوسرے دن ان کھنڈرون کے شمالی جانب اس
 مقام سے دو میل کے فاصلہ پر زمین کھودا شروع کی جہاں
 سلسلہ (مطابق سلسلہ) میں تفتیش کی تھی اور دلچسپاؤ تاج

حاصل کئے۔ پہلے سفر میں ریت کے تو دون کی وجہ سے ان کھنڈروں کو نہ دیکھ سکا تھا جو غالباً دریا کے منتہا پر واقع ہیں اور کسی زمانہ میں یہ دریا سے نیا کے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پہلے پہل مجھے ایک جگہ کھودا تو معلوم ہوا کہ یہ سکوئی مقام رہا تھا اور جب ۴ فیٹ ریت الگ کی تو مکان کی سطح دکھائی دی اور زبان خروشی میں لکھے ہوئے بہت سے تختے مغربی کمرہ سے ہاتھ لگے جب پہلا تختہ بھلا تو میں نے اسکے لئے انعام دیا پھر برابر دوسرے تختے بھی ظاہر ہونے لگے۔ یہ پرانے نوشتے ہندی زبان میں لکھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کسی امیر آدمی نے بیکار کا غدون میں پھینک دیا ہے۔ بعض مستطیل تختے تھیلپن میں تھے جو بطور لفافہ کے استعمال ہوتی تھیں اور بعض دوسری شکلوں کے تھے لیکن سب رسمی و نیم رسمی حساب کتاب میں استعمال ہوئے تھے۔ بہت سے اسی طرح اپنی حالت پر بندھے ہوئے تھے اور بعض پر مہرین بھی تھیں۔

بعض دوسری قسم کا سامان بھی بلاشبہ لٹوی ہوئی چوکی جیسر بوبہ اور یونانی کے وضع کی نقاشی تھی۔ بننے کے آلات جوئے کے فرے، چوہے پکڑنے کا جال، کھانا کھانے کے بڑی بڑی

برتن، چونکہ میں پہلے سے کافی تجربہ حاصل کر چکا تھا اسلئے ان چیزوں میں سے جو ہاتھ لگتی تھی اسے فوراً پہچان لیتا تھا اور سمجھ جاتا تھا کہ یہ کیا ہے۔

اسکے بعد میں اس کھنڈر میں گیا جو ہمارے خیمہ گاہ سے قریب تھا۔ ہوا اور ریت کی غنایت سے صرف چار دیواری کا نشان نظر آتا تھا۔ پہلے پہل اُس جگہ تفتیش شروع کی جو بظاہر طویلہ یا نوکرون کا مکان معلوم ہوئی تھی پہلے معلوم ہوا کہ یہاں سوائے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لکے اور کچھ نہیں ہے لیکن جب قریب فیٹ تک ملے جاتے تو ایک لکڑی کا چھوٹا سا آلہ ملا جو غالباً مٹی ہٹانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس کوڑے کرکٹ میں بعض عجیب چیزیں بھی دیکھنے میں آئیں مثلاً ریشمی، سوتی، اور اونی کیڑے، لوہے اور ہڈیوں کی مہرین۔ آہنی کرطیان لگے ہوئے چمڑے، لکڑی کی قلمیں، لاکھ کے برتنوں کے ٹکڑے، لکڑی کے آلات، سب سے بہتر بارہ عادی تختے ہاتھ لگے جن پر نہایت سلیقہ کے ساتھ چینی خط میں لکھا ہوا تھا اور بعد کو معلوم ہوا کہ یہ تختے اور ہڈیوں کے ہمراہ اس مکان کے مغز باشندوں کو پیشکش کئے گئے ہیں۔ وہاں کے جنوبی کھنڈرون کی مفصل تحقیقات بہت

طوۃ فی ہے اور ہم لکھنے سے مجبور ہیں۔ ان مکانات سے بھی بہت تختے حاصل کئے جو خطوط یا زبان خروشی میں حساب کا دفتر تھے اور نقش و نگار کیے ہوئے تختے اور خانہ داری کا ساما بھی ملا۔ ان مکانون کے قریب چار دیواری سے گھرے ہوئے باغون اور اسفیدار کے تختوں کی علامتیں نظر آتی تھیں۔ بعض درختوں کی علامتیں نظر آتی تھیں۔ بعض درختوں کے تنے جو ریت کے ٹیلوں کے نیچے دب کر بچ گئے تھے وہ بارہ فیض تک بلند تھے۔ اور جو مکان یہاں محفوظ رہ گئے تھے وہ وضع میں ترکستان کی موجودہ عمارتوں سے بہت مشابہ تھے۔ بے درخت کے بیابان اور اُن کا نظارہ بہت فرحت بخش تھا۔ یہ وسیع رگستان بالکل دریا کے مانند ہے صرف یہ فرق ہے کہ درختوں کے تنے اور کھڑی لکڑیاں مکانون کے وجود کا پتہ دیتی ہیں۔ اگرچہ پندرہ دن کی یہ مفید زحمت مفصل نہیں لکھ سکتا ہوں پھر بھی بعض پرالے نوشتے جنھیں میں نے ڈھونڈ نکالا ان کا ذکر لازمی ہے۔ جو وقت اُن کھنڈروں کے مغرب کی طرف میں نے ایک بڑے مکان کی تفتیش کی اور وہاں سے منقش کھڑیاں میسرے ہاتھ آئیں تو میں نے سمجھ لیا کہ اس مکان کا مالک کوئی متمول

آدمی ہوگا اور جب دوسرے کمرہ سے چند لکھے ہوئے نغنے پائے جن میں سے ایک تختہ بین فیٹ بلند تھا تو ظاہر ہوا کہ صاحب خانہ کوئی ذی تربہ شخص تھا۔ پھر اور چیزیں بڑھوٹا دھنے کے لئے دوسرے کمرہ میں گیا جو غالباً اس شخص کا دفتر تھا اور حبوت پہلی کدالی ماری تو نوشتوں کا ایک بستہ برآمد ہوا۔ جس میں سو کپڑوں سے زیادہ تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ نوشتے یہاں مجتمع ہو کر ریت کے نیچے محفوظ رہ گئے ہیں اور دفتر کے متعلق ہیں۔ اس وقت جبکہ ہم زمین کھودنے اور تفتیش کرنے میں مشغول تھے رستم نامی ایک آدمی نے جو دیانت دار اور زمین کھودنے میں تجربہ کار تھا ایک عجیب کشاف کیا۔ حبوت میں سے اُسکی طرف نظر کی تو دیکھا کہ اس نے دیوار کے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک سالم تختہ باہر نکالا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کروں اُس نے پھر ایک اور سبیل تختہ جو ابھی تک اسی طرح لفافہ میں بند اور سرسبز تھا نکال لیا۔ جب ہم نے اس سوراخ کو کشادہ کیا تو اس قسم کی تحریریں کا ایک خزانہ ملا۔ اس دفتر خانہ کے تجسس سے میری سرت بڑھتی جاتی تھی۔ یہ نوشتے گویا سندیں اور معاہدے تھے جو اکثر بندے ہوئے اور سرسبز برآمد ہوئے اور ظاہر ہوا کہ یہ اس مقام پر

احتیاط کے ساتھ رکھے گئے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں ۔
ان مکانوں کی جنوبی سمت بہت تاریک بلکہ تکلیف دہ تھی ۔ مین
جن کھنڈروں میں نفیثہ کرنا چاہتا تھا ان کا زیادہ حصہ ریت کر
ایسے نو درون کے نیچے دب گیا تھا جن کی لمبائی چالیس پچاس گز
تھی اور ان پر گز کے سبز و خشک درخت بھی موجود تھے ۔ تھوڑی دیر
کے بعد سمت شمال میں کچھ فضاے نورانی نظر آئی اور وہیں کچھ آرام
گاہ ۔ اس طرف کے مکان بہت چھوٹے تھے لیکن دلچسپ چیزیں حاصل
ہوئیں ۔ ان کھنڈروں سے ۶۰ گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا چار
گوشہ میدان واقع ہے جس میں نوت کے خشک درخت اب تک موجود
ہیں ۔ بعضوں کے تنے دس بارہ فیٹ تک بلند ہیں ۔ کسی زمانہ
میں ان درختوں کا سایہ ایک حوض پر پڑتا تھا جس کا نشان اب
بھی باقی ہے ۔ جس نہر کے ذریعہ سے دریا کا پانی ان درختوں تک
پہنچایا جاتا تھا اگرچہ اب وہ مٹ گئی ہے لیکن اسکی تلاش چند ان
مشکل نہیں کیونکہ ریت کے ٹیلے کے عقب میں ۹۰ فیٹ لمبا ایک بل
جس سے انسان پیدل گزر سکتا ہے ایک خشک نہر پر قائم ہے اور
وہ ستون جن سے وہ بل بندھا ہوا تھا اب تک کھڑے ہیں اہم اس
خشک نہر کے کنارے شمال و مغرب کی طرف دو میل تک چلے گئے

اگرچہ بعض جگہ وہ ریت کے نیچے پوشیدہ ہو کر نظر سے غائب ہو جاتی تھی لیکن فوراً ہی خشکی میں اور ریت کے تودوں کے بیچ میں دکھائی دینے لگتی تھی۔ اس سرزمین میں ہر طرف خشکی کے آثار نظر آتے تھے۔ اگرچہ اس چار سو میل کی مسافت کے دوران میں جسے میں نے بیان کیے ہیں کیا چرچان کے قریب نیا سے چار خلیک تک کئی مرتبہ تفتیش و تحقیقات کے موقع ہاتھ آئے لیکن ان کی تفصیل میں بیان نہیں کر سکتا۔ جب میں نے سبزہ زار چار خلیک سے لون پور کے کھنڈرون کی طرف روانگی کا ارادہ کیا جنھیں سن ۱۹۰۷ء (مطابق سال ۱۳۲۷ھ ہجری) میں ڈاکٹر ٹرن نے معلوم کیا تھا تو اس سفر کے ضروریات مہیا کرنے میں بہت وقت پیش آئی۔ کیونکہ زمین کھودنے کیلئے ۵۰ نفر مزدور پانچ ہفتہ کی خوراک کا کافی سامان، اور اسکی بار برداری کے لئے بہت زیادہ اونٹ، نیز اس قدر تعداد میں پانی یا برف جو سات دن روانگی اور سات دن واپسی اور مدت قیام میں تمام قافلہ کیلئے کافی ہو سکتا تھا رکھنا لازمی تھا۔ یہ تمام سامان صرف دو تین دن کے عرصہ میں فراہم ہو جانا چاہیئے تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے پاس کل ۲۱ اونٹ ہیں اور ان میں میرے وہ اونٹ بھی شامل ہیں جنھیں میں نے چرچان سے کرایہ پر لیا تھا تو مجھے یہ فراہمی اور بھی دشوار

نظر آئی۔ حسن اتفاق سے دونوں افراد الی شکاری جو ڈاکٹر ہڈن کی خدمت میں رہ چکے تھے۔ اور دوسروں کے بہ نسبت اس قسم کے سفر کے خطوط سے بخیر تھے مجھے مل گئے۔ اگرچہ خورد و نوش کے سرمایہ کا لحاظ کرنے ہوئے اپنی منزل مقصود (شمالی بیابان لوپنور) کی طرےت عجلت ضروری تھی لیکن میں نے آزمائش کے طور پر میران و چار غلیک کے درمیانی کھنڈر اور ابدال کی کچھ تحقیقات کی اور جو چیزیں میں نے یہاں سے ڈھونڈ نکالیں انھوں نے مجھے پھر بیان دہیسی کا شوق دلایا۔

۱۱ دسمبر ۱۹۰۷ء (مطابق ۱۳۲۷ھ) کو دریائے تارم سے جوا بنک منجھند نہ تھا گزر کر اپنے قافلہ کو ابدال سے آگے بڑھایا۔ ایک روز لوپنور کے مشرقی سمت میں خوش قسمتی سے مجھے ایک منجھند ٹالابل گیا اور جتنے اونٹ مل سکے ان سب پر میں نے برف بار کر لی ان کے علاوہ تقریباً ۳ گدھے بھی برف سے لادکے روانہ کر دیئے تاکہ ہمیں نصف راہ میں مل جائیں۔ ہماری یہ راہ غالباً اس راہ کے قریب ہو جسے ڈاکٹر ہڈن نے دہیسی کے وقت اختیار کیا تھا اس راہ میں قطب اور کھنڈرون کی ان علامات کے سوا جہن ڈاکٹر ہڈن نے اپنے نقشہ میں بہت اچھی طرح ظاہر کیا تھا کوئی علامت نہ تھی اور راہ پر بھی نہ تھا ہوائیں کہ لوپ کے شکاری بھی اس راہ سے نہ گزرے تھے۔ ہم ۱۵ دسمبر کو

اسفیدار اور گرز کے درختوں سے گزر کر جو اس ہادی کی انتہا میں واقع
 ہیں ایک ایسے موضع میں پہنچے جو سخت ہواؤں کے اثر سے
 ویران ہو گیا تھا (جیسا کہ لوہنور کے شمالی حصہ کا خاصہ ہے) چونکہ نیز
 ہواؤں کی وجہ سے ریت کے ٹیلے نشینی حالت میں تھے (اور ان کے
 دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں ہوا شمال و شرق سے جنوب کی طرف
 چلتی ہے) اسلئے ہمارے اونٹوں کے پاؤں کو بہت تکلیف پہنچی
 جسکی وجہ سے ان کی نعلبند سی ضروری تھی۔ اگرچہ طلوع آفتاب کے
 ایک رات تک ہم سفر کرتے رہے لیکن ۴۰ میل سے زیادہ ایک
 دن میں نہ چل سکے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس کو ارجح میں پہلے ایک
 بڑا دریا تھا اور جس قدر آگے چلے اُتنے ہی زیادہ پتھر کے آلات
 و سامان ملے۔ مثلاً سنگ چھانی کے تیر اور ناہموار برتن وغیرہ اور
 معلوم ہوا کہ یہ سامان عہد حجری سے تعلق رکھتا ہے۔ اب کچھ شک
 نہ رہا کہ تاریخی زبان سے پہلے یہاں انسان آباد تھے۔ اس وقت
 شمال و شرق سے بہت سرد ہوا چل رہی تھی۔ آدھی رات کے
 وقت ہوا کے تیزی کی وجہ سے ہمارا خیمہ گرتے گرتے بچ گیا۔ تقریباً
 تمام مدت اقامت میں ہم اس ہوا کی وجہ سے تکلیف اٹھاتے رہے۔
 لہ عہد حجری اس لئے کہتے ہیں جب انسان اپنی ضروریات کا نام سامان صرن پتھر کا بنا دیکھو۔

خفہ و ما آخری چند ہفتون میں جبکہ درجہ حرارت صفر سے بھی نیچے اتر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے درختوں کے پتے آگ جلانے کیلئے بہت سے پتے مل گئے ورنہ اہل قافلہ کو سردی سے بہت تکلیفیں پہونچتیں۔

اُسوقت مجھے حد درجہ کی مسرت ہوئی جب ۱۰ دسمبر کو ہملاٹیلہ جو اس مقام کی علامت ہے مجھے نظر آیا۔ رات کے پہلے حصہ میں بتخانہ کے کھنڈروں تک پہونچ کر ہم نے خیمہ لگائے۔ اس عجیب سرزمین میں یہ بتخانہ قدیم کھنڈروں کے قریب علامتِ سرحد کی طرح واقع ہو گیا۔ ہر روز تک متواتر وہاں تقشیش کی چونکہ ہمارے ساتھ مزدور زیادہ تھے اسلئے تمام لمبہ صاف کر ڈالا اور مفید نتیجے حاصل کئے یہاں بھی نیا کے مکانات کی طرح گچ اور لکڑی کے مکانات بنائے گئے تھے جنھیں تیز ہواؤں کی وجہ سے نقصان پہونچا ہے یہاں تک کہ مشرقی اور مغربی دیواریں جو مٹی سے مضبوط بنی ہوئی تھیں بالکل سٹ گئی ہیں لیکن شمالی و جنوبی سمت کی دیواریں اب تک نظر آتی ہیں اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہاں ہوا ہمیشہ مشرق کی طرف سے چلتی ہے۔ حسن اتفاق سے کئی جگہ پرانی چیریں باقی رہ گئی تھیں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے نیچے (جو اس مقام کے وسط سے سو فیٹ

سہ یعنی حالتِ انجماد سے بھی زیادہ سردی تھی۔

لسبا تھا اور غالباً پہلے قلعہ ہوگا) ہمیں اُن کا ایک خزانہ ملا۔ باوجودیکہ وہ
 چھوٹا محل اور بہت کم مکانات باقی رہ گئے تھے پھر بھی کاغذ اور
 لکھی ہوئی تختیاں جو اکثر چینی زبان اور ملکی کاروبار کے متعلق تھیں
 ہمارے ہاتھ لگیں۔ زبان فردوسی میں لکھے ہوئے بہت تختوں سے
 معلوم ہوا کہ لونپور میں بھی نیا کی طرح ہندوستان کی وہی پُرا نی
 زبان رواج پذیر تھی اور ملکی و کاروباری امور میں استعمال کی جاتی تھی
 عمدہ نقش لکڑیاں، صنعتی اشیاء، ہات کی مہرین، اور دوسری چیزیں
 بھی زیادہ ملین ان چیزوں سے ظاہر ہوا کہ بودھ اور یونان کی
 صنعت و حرفت جس کا کسی زمانہ میں پشاور، کابل، بلخ، اور نیا
 میں رواج تھا وہ لونپور میں بھی موجود تھی۔ جو چیزیں کہ میں نے نیا
 میں پائی تھیں وہ ان چیزوں سے اس قدر مشابہ تھیں کہ گویا یہ مقام
 بھی نیا کی طرح تیسری صدی مسیحی کے آخیر میں ویران ہوا ہے۔ ہماری
 تحقیقات کے نتائج سے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ان کھنڈروں
 کے بڑے بڑے مکانات چین کی فوجوں کے لئے مخصوص تھے اور ایسا
 معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوجیں اس بڑی شاہراہ کی حفاظت کے لئے مامور
 تھیں جو تنگھا، ننگ، مغرب کی طرف کوسنو اور دریائے تارم کے بنوزاروں
 کی طرف لگتی ہے۔ قدیم چینی نوشتوں سے یہ بھی مجھے معلوم ہوا کہ

وہ براہ ایک سو دس سال قبل مسیح تک اس دیابان میں جاری تھی اور چین کے تجارتی و سیاسی مقاصد کی توسیع کے سبب طبقہ ہن کے زمانہ سلطنت کے آخر تک اس طرح باقی تھی۔

اگرچہ مسند ددلی میں تھیں کہ اس مغربی سمت کے قریہ کی اہمیت تجارت کے سبب سے بھی زراعت کی وجہ سے نہ تھی لیکن خشکی کے باعث وہاں اس قدر حیرت انگیز طبیعی تغیرات ہو گئے ہیں کہ مشرق کی طرف ایک سو پچاس میل تک پینے کے قابل پانی نہیں ملتا۔

جب میں نے الشمس بلک کے چشموں پر بعض اونٹوں کو پانی لانے کے لئے بھیجا تو وہ پانی اس قدر کھاری تھا کہ پندرہ دن کی تشنگی کے باوجود اونٹ نصدا اُسے نہ پی سکے اور اگرچہ شدید سڑی تھی لیکن کھاری ہوئے کی وجہ سے وہ پانی جمانے لگا۔ میں شہالی سمت کے چشموں میں پانی ڈھونڈنے سے ناامید ہو گیا برت کا ذخیرہ بہت ہی کم رہ گیا تھا قافلہ کے بعض لوگ بیمار بھی ہو گئے اور معلوم ہوا کہ یہ سردیوں کو بہت سخت تکلیف پہنچا رہی ہے اسلئے بہت اچھا ہوا کہ ان گھنڈروں میں ہمارا کام ۲۹ دسمبر ۱۹۷۷ء (مطابق ۱۳۵۷ھ) کو پورا ہو گیا۔ زیادہ تر اپنے خیمہ اور اشیاء قدیمہ جو کچھ حاصل کی تھیں انھیں ابدال بھیج دیا اور میں خود چند

لوگوں کے ہمراہ اس جنگل میں سے جسے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ شمال و مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ اگرچہ یہ راہ تکلیف دہ تھی لیکن دلچسپ بھی تھی۔ سات دن کے بعد سلامتی کے ساتھ تارم کے منجھتا لالہ بابر داروہوا۔ اس سے آگے جانا ممکن نہ تھا کیونکہ ریت کے ٹیلے بلند اور اونپور کی راہ سے زیادہ دشوار گزار تھے۔ چونکہ اس راہ میں درخت بھی نہ ملے اسلئے سردی کی وجہ سے ہمیں بہت تکلیف پہنچی کیونکہ ہوا حالت انجامد سے بھی ۴۸ درجہ زیادہ سرد تھی اسکے بعد میران کے کھنڈرون کی تحقیقات کے لئے چار خلیک کی طرف روانہ ہوا میران بالکل ویران جگہ ہے اور ریت کے ان ٹیلوں کے قریب واقع ہے جو کوہستان سے اونپور تک چلے گئے ہیں۔ تین ہفتہ تک میں وہاں کام کرتا رہا اور اس عرصہ میں ٹھنڈی ہواؤں نے جو تکلیف پہنچائی وہ کبھی نہ بھولے گی لیکن اس تمام محنت کے بعد نتائج بھی بہت عمدہ حاصل ہوئے۔ جو وقت میں نے پہلے پہل قلعہ کے کھنڈرون میں کھودنا شروع کیا ہے اسی وقت کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

اس قلعہ کے کمرون میں (جو پہلے آٹھویں صدی سے نوین صدی مسیحی تک نبت کی فوجوں کی چھاؤنی تھا) مٹی بہت زیادہ تھی۔ فٹ تک کوڑا ہٹانے کے بعد ایک نہار تختے اور کاغذ لکھے ہوئے برآمد ہوئے

اُن میں زیادہ ترقی زبان میں تھے اور بعض کی زبان کوک ترک کی یعنی
قدیم ترکی زبان کے مشابہ تھی۔ دوسرا سامان مثلاً ٹوٹے ہوئے برتن
پہننے کے کپڑے، اور اسلحے وغیرہ بھی بہت ملے۔ وہاں کی کثافت
سے ظاہر ہوتا تھا کہ بت کی فوج کس نکبت اور ادبار کے ساتھ اس
سرحدی چھاؤنی میں زندگی بسر کرتی تھی۔

یہ مسلم ہے کہ یہ قلعہ اُس بڑی شاہراہ کی حفاظت کے لئے یہاں بنایا
گیا تھا جو تارم کے جنوبی سبزہ زار سے نوہانگ تک جاتی ہے بتخانہ بودہ
کے چند کھنڈر جو قلعہ کے قریب واقع تھے انکی تفتیش کر کے بہت پرانی
اور عمدہ چیزیں حاصل کیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متبیون کے قلعہ بنانے
سے چار سو سال قبل یہ بتخانہ ویران ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک
بتخانہ میں گچ کا بہت بڑا ستونہ ملاحظہ ہو جس پر درجہ کی شکل نقش تھی۔ بعض
ٹوٹی ہوئی دیواریں یونانی وضع پر کھدی ہوئی دیکھنے میں آئیں ظاہر
ہے کہ پرانے زمانہ میں یونانی صنعت یہاں موجود تھی۔ بالائی ستونوں
کی نقاشی سے جو بودہ مذہب کی عبادت دروایات ہیں یہ اچھی طرح
معلوم ہوتا ہے کہ صنعت نقاشی میں بھی نہر حجازی کی طرح ہندوستانی
خیالات و موضوعات کو نہایت ذہانت کے ساتھ یونانی تصویروں کا
لباس پہنا کر جلوہ گر کیا گیا ہے اور بیشک یہ یونانی بودہ فنونِ لطیفہ پر

خاص اصال عظیم ہے۔ لیکن ہوائی اختلافات کی وجہ سے اس زمانہ کی صفت
 کا کوئی اثر خود ہندوستان میں نظر نہیں آتا۔ دیوار کے حصہ زیرین کی نقاشی
 بھی بہت دلچسپ تھی وہاں بالدار اور مہیب فرشتوں کا نصف جسم بہت
 مہارت کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ مہیب سے زیادہ نادر لونڈی غلاموں کی
 تصویروں کا دائرہ تھا جو عیش و عشرت کی زندگی کا تمام ضروری سامان
 لیے ہوئے پھولوں کے جھرمٹ میں موجود تھیں جن کا وجود ایسے بیان
 میں جو چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اجتماعِ مذہب سے کم نہیں
 فردوسی زبان کے نوشتہ جات جو میں نے ڈھنڈھے مکے اُن سے ظاہر
 ہوا کہ یہ تجناہ تقریباً تیسری صدی سبکی سے دیران و برباد پڑا ہے۔
 غرض کہ میران سے ابدال کی طرف گیا ہر چند کہ وہاں نیچے چھوٹے
 چھوٹے تھے اور میں اُس سامان کے باندھنے اور رکھنے میں مصروف
 تھا جسے میں نے چار مہینوں میں حاصل کیا تھا پھر بھی میران کی تکلیفوں
 کے بعد ابدال کا یہ ایک ہفتہ کا قیام بہت راحت بخش تھا۔ میں نے
 ایک بڑا قافلہ دو ترک ملازمین کی ہمراہی میں جو سفر کے سختیوں کو جو
 سے ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تھے کا شعر دانہ کیا کہ یہ لوگ وہاں
 جا کر سب چیزیں مکارٹنی صاحب کے سپرد کر دیں اور خود میں نے ۲۱
 فروری ۱۹۲۵ء مطابق ۱۵ شعبان ۱۳۴۴ھ کو اس ترتیب کے ساتھ ایک لمبے

سفر کا ارادہ کیا کہ لونپور کے ٹیلون سے سیدھا تو نہانگ کی طرف جو کنسو کی مغربی سرحد پر واقع ہے جا کر وہاں سے دارالسلطنت چین کے قریب پہونچ جاؤں۔ یہ وہی راہ ہے جسے مارکو پولو نے طے کیا ہے اور مارکو پولو سے چھ سو برس قبل ہیون سانگ بھی ہندوستان کے طویل سفر کے بعد وہ مذہب کی یادگارین اور مقدس کتابین لیکر اسی راہ سے چین کی طرف پلٹا تھا۔

ولادت مسیح سے ۲۰۰ سال قبل یعنی اسوقت سے جبکہ حکومت چین نے اراضی دریائے نارم پر اپنا سیاسی اثر و اقتدار قائم کیا تھا اور اسکے مدون بعد تک یہ بیابان باہر کہ جو تین سو پچاس میل طولانی ہے کاروانوں اور قافلون کی گزرگاہ بنا رہا اگر کبھی متروک ہوا تو اسکا باعث مغربی سمت میں حکومت چین کی قوت کا انحطاط تھا یا ہمسایہ ملک سے قطع تعلق ہو جانے پر تجارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے اور سرحدات کی حفاظت ضروری تھی۔ لیکن ۲۵ سال سے پھر یہ شاہراہ کھول دی گئی ہے۔ چونکہ اس راہ میں پینے کے قابل پانی نہیں ملتا اس لئے جاڑوں کے موسم میں برہنہ ہمراہ لیکر اس راستہ سے سفر کرنا ممکن ہے۔ ہم نے سترہ دن میں اس راہ کو طے کیا اور اس عرصے میں جغرافی معلومات کے لئے کافی فرصت ملی لیکن اس کی اور کوئی تفصیل یہاں

نہیں لکھ سکتے صرف یہ کہ دریائے سولہوہ کی اراضی سے گزر کر اس جگہ پہنچا جو سبزہ زار تو نہونگ سے باغ منزل دور ہے۔ پہلے چھاؤنی کے کھنڈر پھرا سکے بعد اس دیوار کا نشان ملا جو اس سے مل جاتی ہے۔

حسن اتفاق سے چھاؤنی کے ایک برج کے قریب جب میں نے تھوڑی سی زمین کھودی تو بعض قدیم چیزیں مع چند تختوں کے جو چینی زبان میں لکھے ہوئے تھے نکلیں اور انہیں اسے راہ میں بھی اشارت دیمہ کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ کھنڈر رسم قدیم کے مطابق استحکام سرحد کیلئے بنائے گئے تھے۔ امد و نعت میں سرحد کا تسو کی بڑی دیوار کے مشابہ ہیں۔

میں نے تو نہانگ میں چند روز توقف کیا جیسے ہی اہل قافلہ اور جانور زحمت سفر سے کسی قدر آسودہ ہوئے پھر دوبارہ اسی سرحد بیا بان میں سرحدی دیوار کے کھنڈروں کی تحقیق و انکشاف کیلئے اپنا اگرچہ بہت دشوار کام تھا لیکن نوائد بھی بہت خوشگوار حاصل ہوئے یہ دیوار اس بیابان میں واقع ہے جہاں قصبہ انھسی کی سرحد سے مشرق کی جانب تمام تر سنگہیرے پھیلے ہوئے ہیں صرف بعض مقامات پر جنگل کے ٹکڑے اور ریت کے تودے نظر آ جاتے ہیں۔

چونکہ تو نہانگ کے حاکم اور تمام صاحب منصب لوگ ان کھنڈروں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے اسلئے میرے کاموں سے خوش اور

ادا ذکیلے موجود تھے لیکن عوام کے تعصب سے کسی راہنمائے ہماری رفتار
 نہ کی لہذا بعض ایسے مقامات پر جان کہ چند میل تک یہ دیوار بالکل
 سٹ گئی تھی اور بعض جگہ زمین کے نیچے نامعلوم طور پر واقع تھی
 مجھے کو دیوار کا نشان پیدا کرنا ضروری ہوا۔ سب اسے زیادہ خرابی یہ
 تھی کہ زمین کھودنے کے لئے اچھے مزدور نہ ملے جو لوگ کہ مرنے کا کم
 تو نہانگ کے خوف سے اس ہونانگ بیابان میں ہمارے ساتھ آئے
 تھے اگرچہ میں ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا تھا پھر بھی سب کے
 یہ خوف رہتا تھا کہ میں یہ لوگ بھاگ نہ جائیں یا نیند اور رخا کر کجالت
 میں (جیسا کہ انیوینین کا قاعدہ ہے) بیابان میں کھونہ جائیں۔ خلاصہ
 یہ کہ پہلے شمالی سفر گزار کی طرف گیا پھر تو نہانگ کے مغربی بیابان
 کی راہ سے پرانی دیوار تک پہنچا۔ دو ماہ کی مدت میں انھیں سر مغربی
 سفر کی انتہا تک ایک سو سچاس میل دیوار کا نشان دیکھا۔ اشیائے قیمتی
 کے لئے بڑی فوجی چھاؤنیوں کی تقشیش کی جو دیوار کے قریب واقع
 تھیں۔ میرے سب سے بہتر رہنما وہی بڑے برج تھے جو ایک دوسرے
 سے دو یا تین میل کے فاصلہ پر واقع تھے۔ ان برجوں کے قریب ہمیشہ
 مجھے سپاہیوں کے رہنے کے چھوٹے چھوٹے مکان نظر آتے رہے۔ مینی
 زبان کی تختیوں سے جو مجھے ہر کنڈر میں ملی تھیں اور جنہیں ان نے

اپنے محر جیانگ سویہ کی امداد سے پڑھا تھا معلوم ہوا کہ یہ سرحدی خط ولادت مسیح سے ۲۰۰ سال قبل موجود تھا اور ونی کے زمانہ سلطنت میں حکومت چین کے حدود وسط ایشیا تک پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ جن خطہ میں تاریخ تحریر بھی ان سے معلوم ہوا کہ سو برس قبل مسیح سے ڈیڑھ سو برس بعد مسیح تک اس سرحد پر محافظ سپاہی مقرر تھے۔

دریا سے سولو ہو کے جنوبی ملک کی حفاظت اس دیوار کی بنا کا مقصد اصلی تھی۔ کیونکہ وہ ملک چینی افواج و حکام سیاسی کے قیام و گزرگاہ کے لئے جو چین کی انتظامی طاقت کی توسیع اور مضبوطی کی غرض سے اراضی دریائے تارم پر بھیجے جاتے تھے بہت اہمیت رکھتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب انتظام اپنے شمالی دشمن یعنی ہسینو گنو کے حملوں کو دفع کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اندھین جو ہسینو گنو کی اولاد میں تھے کئی صدی بعد تک دریائے ڈنیوب اور پو کے حدود تک تسلط و اقتدار رکھتے تھے۔ جن میں پر یہ دیوار بنائی گئی ہے وہ اشیائے قدیمہ کی حفاظت و نگہداشت میں خصوصیت کامل رکھتی ہے۔ کیونکہ جو چیز سنگرین یا خاک میں چھب گئی وہ بالکل سالم رہ گئی تھی۔ چونکہ اس بیابان میں تقریباً دو ہزار برس سے چندان بارش نہیں ہوئی اور وہ کھیتی کی گئی بلکہ تیز ہواؤں کے اثر سے بھی محفوظ رہا اس لئے جو چیزیں

مجھے منشی کے نیچے سے ملین شلا لکھی ہوئی تختیان، ابرشیم، لباس، ایسا باہا،
 خانہ داری کا سامان، اور وہ سب پتھرین جو علم آمار قدیمہ کیلئے مفید تھیں
 بالکل سالم اور بے عیب باقی رہ گئی تھیں۔ بعض اوقات فوجی چھاؤنوں
 کے کھنڈروں کے قریب تھوڑی سی ریت ہٹا سکتے بعد کوڑے کا ڈھیر
 دکھائی دیتا تھا اور اس میں سے لکھے ہوئے تختے اُسی طرح ملتے تھے جطرح
 اُن افسرانِ ملکی نے قبل ولادت مسیح انھیں باہر بھیک دیا تھا۔ بادِ جو دیکہ
 دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور یہ تختے سامانِ غیر متعلقِ شلا
 گھاس، پرانے کپڑے وغیرہ، میں پڑے ہوئے تھے بھر بھی نئے معلوم
 ہوتے تھے۔ میرے ڈھونڈھے ہوئے نوشتوں کی تعداد دو ہزار تک
 پہنچائی جو زیادہ تر ملکی و فوجی نظم و نسق و حرکت و انتظام وغیرہ کے
 متعلق تھے۔ علاوہ ان سرکاری چیزوں کے خانگی خطوط بھی ملے جو
 عہدہ داروں کے عزیز و اقارب نے انھیں بھیجے تھے۔ ان نوشتوں
 کے دیکھنے (جو ان تمام نوشتوں میں سب سے زیادہ پرانے تھے) اب تک
 چین و وسط ایشیا میں حاصل ہوئے ہیں، نیز ایران و کھنڈر مکانات
 کے ملاحظہ سے یہ اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان ویران حدود میں طرز
 زندگی کیا تھا۔ بعض خطوط ایرانی زبان میں بھی ملے جو اسکی دلیل تھے
 کہ مغربی ممالک سے حکومت چین تک اس راہ کے ذریعہ سے جو دیوار کے

سبب سے محفوظ تھی تجارت کیجاتی تھی اور یہ معلوم ہوا کہ یہ خطوط ایرانی
یا مغربی ترکستان کے تاجروں کے ہیں جو ریشمی کپڑوں کے لئے چین
میں آتے تھے۔

اگرچہ ایسے بیابان میں جان کچھ پیدا نہیں ہوتا ایسے دفاعی استحکام
بنانا بہت مشکل کام تھا لیکن چین کے قدیم انجینروں کی مہارت اس
اور زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ہر مشکل برداشت کرنے پر ثابت
قدم رہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے اپنے اس مدافعتی خط کو کھاری
تالابوں اور دریاؤں تک پہنچا دیا ہے اور ان کو منبر لہ سہ کے قرار دیا
ہے کیونکہ ان تالابوں کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ دیوار بنانے کے لئے
انھوں نے جو بعض چیزیں استعمال کی ہیں اگرچہ بظاہر انکی کوئی اہمیت
نہیں معلوم ہوتی لیکن وہ اس کام کیلئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔
چنانچہ دو ہزار سال کے بعد بھی اب تک باقی ہیں۔ مثلاً ان کے لٹھے
جو تالابوں میں پیدا ہوتے ہیں ایک دوسرے سے مضبوط باندھ کر
دیوار کے گارے میں استعمال کئے گئے ہیں مٹی اور پانی کی شویت
استداد زمانہ کی وجہ سے دیوار میں قریباً حالت حجریت پیدا ہو گئی
ہے اور اب وہ تند و تیز ہواؤں کے سوا تمام قوتوں کی دستبرد سے
محفوظ ہے۔ انسانے معائنہ میں نے کئی بار دیکھا کہ جہاں دیوار

متوازی ہے یعنی ہوا کے رخ پر اس کا طول واقع ہوا ہے، بالکل منھو ہے اور جہاں دیوار کا عرض ہوا کے رخ پر واقع ہوا ہے، وہاں ریت سے ٹکڑا ٹکڑا کر بالکل ٹوٹ گئی ہے بالکل محو و نابود ہو گئی ہے۔ اس زمانہ میں ہوا شمال با شمال و مشرق کے گوشہ سے بہت سختی اور تیزی کے ساتھ چلتی ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ ہوا جب سے یہ دیوار اسبیطح تباہ و برباد پڑی ہے۔

اس سرحدی دیوار کا عرض ہر جگہ ۶ فٹ ہے اور اس وقت بعض مقامات پر دس فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ انجینروں کی قابلیت و مہارت اُن طلباء کے برہنہ کو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے جو باوجود اسباب و مزدوروں کی قلت کے بنائے گئے ہیں یہ برج اگرچہ کچی اینٹوں کے بنے ہیں لیکن مضبوط اور بلندی میں ۳۰ فٹ بلکہ اس سے زیادہ ہیں ایک چھوٹا قلعہ جو گویا یونان کے دروازہ کی علامت تھا اور جسکی تلاش میں چینی لوگ بیکار محسوس کر چکے ہیں نظر آیا۔ اس قلعہ کی دیواریں مٹی سے مضبوط اور پندرہ فٹ چوڑی ہیں۔ ایک عمارت اور بھی ہے جو بہت شاندار مضبوط، اور پانسو فٹ لمبی ہے جسکی دیواریں ۶ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ بلند ہیں۔ پہلے اسکے طول سے مجھے خیال ہوا کہ یہ کوئی مکان ہے لیکن اُن خطوط سے جن میں تاریخ درج تھی معلوم ہوا

کہ ولادت مسیح سے سو برس قبل یہ ایک بڑا اسلحہ خانہ تھا اور ان فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو وہاں سے گزرتی تھیں یا وہاں مقیم تھیں۔

ان چند ماہ کے معلومات اور تجزیوں کی تفصیل جو چین کی قدیم سرحدی دیوار کے قریب نہایت خوشی سے گزرے بہت زیادہ ہے۔ اور یہاں بہت مختصر درج کیلگی ہے۔ اُس زمانہ میں جبکہ غروب آفتاب سے قبل برج کے سامنے والے کھنڈروں میں کھڑے ہو کر ان برجوں کی طرقت دیکھتا تھا جہاں آفتاب کی کرنوں سے منور تھے اور دس میل سے زیادہ فاصلہ نظر آنے تو فقط گزشتہ دو ہزار سال ناچیز ہی نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ میں یہ گمان کرتا تھا کہ اس وقت بھی ان برجوں میں سپاہی موجود ہیں اور سبزوار سماتا شاہ کچر رہے ہیں۔ برجوں کے علاوہ اور چیزیں بھی سورج کی کرنوں سے صاف و شفاف نظر آتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک عجیب غریب خط مستقیم اُس دیوار کے پہلو میں ۲۰ فٹ تک کھجا ہوا نظر آیا لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک بگڑی ہوئی راستہ کا نشان ہے جو سپاہیوں وغیرہ کے آمد و رفت کی وجہ سے اُس ریشمان میں پیدا ہو گئی تھی اس سر زمین میں پاؤں کے نشان مدت تک باقی رہتے ہیں چنانچہ ہمارے پاؤں کے وہ نشان جو دو ماہ پیشتر کے تھے ایسے معلوم ہونے لگے کہ گویا ہم ابھی گزرے ہیں۔

اس نکل کی تیز اور سرد ہوا کی بدولت ہم بہت تکلیف میں تھے باوجود
ہمارے اور کوٹ بہت دیر تک بھر بھی وہ ٹھنڈی ہوا میں جواہ اپریل تک
چلتی رہیں بہت موثر اور تکلیف دہ تھیں۔ شروع اپریل میں ہوا حالت
انحار سے ۳۹ درجہ زیادہ سرد تھی لیکن ختم اپریل سے پہلے گرمی اور آفتاب
کی حرارت بہت تیز ہو گئی۔ جب ہوا بند ہو جاتی تھی اس وقت مجھ کو بغیر
کاغذ (ہمیں اور ان جانوروں کو تکلیف دینے کے لئے جو پانی کی وجہ
سے وہاں ٹھہر جاتے تھے) کمرون سے نکل پڑتا تھا۔ وحشی اونٹ بھی ان
بھڑوں سے ڈرتے تھے چنانچہ ہم نے دیکھا کہ وہ چراگاہ سے دوہلے درخت
رگستان میں سویا کرتے تھے۔

کھاری پانی کی وجہ سے بھی ہم سخت تکلیف میں تھے۔ یہاں تک کہ
کمرون کے اندرونی چشموں میں بھی میٹھا پانی نہیں ملتا تھا۔ جب نصف
ماہ مئی میں ہمارے کام ان حدود میں تمام ہو گئے تو ہم بہت مصروفیت کے
ساتھ سنو زار تو نونوگ کی طرف ہم کام کیلئے چلے۔ اس سے پہلے
۱۹۰۲ء میں میرے دوست پروفیسر وکولزی نے مجھے بودہ کے تبرک غار
دیکھنے کا شوق دلایا تھا جنہیں وہ ۱۹۰۱ء میں دیکھ چکے تھے۔ یہ غار
بودہ کے ہزار محلوں کے نام سے مشہور اور سنو زار کے جنوب و مشرق
میں واقع ہیں۔ ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء (مطابق ۱۳۲۵ھ ہجری) میں جس وقت

کہ میں تو نہ انگ میں پہنچا اور عجبت ان غاروں کو دیکھا تو سب چیزیں
 امید کے موافق پائیں۔ لیکن چونکہ عدیم الفرستی کی وجہ سے ٹھہر نہ سکا
 اسلئے اب ان پر از صنعت خزانوں کو دیکھنے اور بغور معائنہ کرنے کیلئے
 پٹیا۔ وہاں کئی سو چھوٹے بڑے غار نظر آئے جنہوں نے بے ترتیب
 قطاروں کے ساتھ دامن کوہ کو چھلنی کر رکھا تھا۔ جسوقت میں نے تفتیش
 شروع کی تو دیکھا کہ ان غاروں کی بچتہ دیواروں پر بہت سی عجیب
 تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں اپنی وضع و ترکیب میں بودہ کی
 صنعت نقاشی سے بہت مشابہ تھیں جو ہندوستان سے مشرقی ترکستان
 میں منقل ہوئی تھی۔ ان کا پہچانا مشکل نہ تھا کیونکہ بیا بان ختن کے
 کھنڈروں میں ایسی بہت تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔ کھدے ہوئے پتھر بھی
 ان غاروں میں بہت تھے۔ آثار قدیمہ سے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ غار
 یہ طبقہ، ناگ کے زمانہ کی پرستش گاہیں اور یادگار ہیں۔ اسی زمانہ
 میں آٹھویں صدی سے نویں صدی مسیحی تک بودہ مذہب نے چین میں
 اوج ترقی پر ارتقا پایا ہے اور تقریباً دو صدی تک وہ حدود سلطنت دشمنوں
 کے دستبرد سے امن میں رہی ہے یعنی شمال سے ترک اور جنوب سے
 اہل بت کی۔ لیکن حکومت ننگوں کے زمانہ میں انقلاب وقت کی وجہ
 سے ان بتخانوں کی رونق مٹ گئی اور بیجاری مرد و عورت جو ان

بتجانوں کے مجاور تھے ان کی تعداد بھی گھٹ گئی ہے لیکن تو نہانگ میں
 بودہ کی تقویٰ و برہیزگاری باوجود اس زمانہ کے انقلاب و انہدام کے
 اب بھی اُسی طرح باقی ہے۔ واقعی تو نہانگ کے عام لوگ اپنے مخصوص
 تعصب کے ساتھ چین کے مخلوط مذاہب میں بودہ کی عبادت کے بعض
 طریقوں کی اب تک پابندی کرتے ہیں۔ یہ ظاہر تھا کہ ان بتجانوں کی
 نقاشی و حجاری کے متعلق میری تحقیقات صرف ان کا عکس لینے
 اور نقشہ کھینچنے تک منحصر تھی۔

مین ۲۰۔ مئی ۱۹۰۷ء (مطابق ۱۳۲۵ھ ہجری) سے ایک عرصہ
 ان بتجانوں کے قریب خیمہ لگا کر مقیم رہا اس کا سبب یہ تھا کہ میں اپنے
 دل میں اس بتخانہ سے بہت اہم چیزیں حاصل کرنے کے منصوبے باندھتا
 تھا۔ دو ماہ سے افواہا سن رہا تھا کہ یہاں قدیم تحریروں کا ایک دفینہ نکلا
 ہے۔ اس طرح پر کہ تاوی نامی ایک پجاری اس بتخانہ کی مرمت کرانے
 میں اتفاقاً اس دفینہ تک پہنچ گیا چونکہ وہ نوشتے کمال احتیاط
 کے ساتھ اُس معبد میں محفوظ تھے اسلئے بغیر خاص واقفیت و تدبیر کے
 انہیں حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ تاوی نامی پجاری جو ان نوشتوں کا
 محافظ تھا وہ بڑا دہمی اور شکی آدمی تھا۔ چونکہ اپنی جہالت کی وجہ سے
 وہ واقف نہ تھا کہ میرے زیر حفاظت نوشتے کیا چیز ہیں اسلئے اپنے

دیوتاؤں اور انسانوں سے بھی بہت ڈرتا تھا۔ ابتدا میں اس کا رام کرنا ہمارے لئے بہت مشکل تھا۔

ہماری کشمکش اور اُس کے معقول و نامعقول اعتراضوں کی تفصیل بعد کو لکھی جا دے گی۔ آخر کار محض غیبی امداد سے اس نے جرأت کر کے ہمارے لئے دروازہ کھولا جو یہ نوشتے ظاہر ہونے سے پہلے بند اور دیوار کی نقاشی میں نہبان تھا۔ اس چھوٹے سے گھر کو دیکھ کر میری آنکھیں خیر ہو گئیں جو وقت اُس بیماری نے اپنا چراغ جلایا تو میں نے دیکھا کہ پرانے کا غذا ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں گویا ایک خرمن ہے جس کی بلندی افیٹ ہے اس تاریکی میں اُن نوشتوں کو دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن جو وقت اس بیماری نے اُن تحریروں کے چند بستے باہر لا کر ہمیں دیکھ لینے کی اجازت دی اس وقت میرا شوق حد سے بڑھ گیا بس سے پہلا پلندہ جو میں نے دیکھا وہ بہت پرانا لیکن ابھی سالم تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ چینی زبان میں بودھ مذہب کی کتاب ہے اور وضع و ترتیب سے ظاہر تھا کہ بہت پرانی ہے۔ ان کا غدون کے اصلی تاریخ کی تحقیق درجن کے انبار کی بلندی دس گز بھی مشکل تھی۔ لیکن جب میں نے ایک پلندے کو دیکھا تو کوئی شک نہ رہا کہ یہ تحریریں اس زمانہ کی ہیں جب کہ ہندی خط اور علم سنسکرت کو پیروان بودھ مذہب نے وسط ایشیا میں

رواج دیا ہے۔

سب تحریریں اسی طرح اپنی پہلی حالت پر باقی تھیں۔ وہاں مین
 نمی کا کبھی اثر نہ پایا۔ واقعی ان کا غدون کے امتداد خیال کی حفاظت
 کے لئے اس کمرہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ مکان پتھر کے
 بہاڑ میں غار کی طرح واقع ہے اور نہ ہی سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے
 بہت مضبوط و مسدود کیا گیا ہے۔ جب ہم نے ایک بڑا بستہ کھولا
 اسوقت میں بہت خوش ہوا، اس بستہ کا کپڑا سوتی اور بہت مضبوط
 تھا جس میں سے یہ چیزیں برآمد ہوئیں۔ بہت عمدہ سوتی اور ریشمی جھینٹیں
 اور سادے ریشمی کپڑے جو بطور نذر پیش کیے گئے تھے۔ نقاشی کیے
 ہوئے انواع و اقسام کے کاغذ، ہر قسم کے جھنڈے اور جھنڈیوں کے
 پردے، آہنی کڑیاں لٹکے ہوئے کپڑے، منقش ریشمی پرے جو بطور
 پرچم کئے استعمال کئے جاتے تھے۔ ان سب چیزوں پر بودھ کی
 تصویریں ہندوستانی باد کی کسی وضع کی چینی سلیقہ کے ساتھ بنی ہوئی
 تھیں۔ اپنے دیوتاؤں کی تصویروں کے نیچے پجاریوں کی تصویریں
 اس زمانہ کے مخصوص عابدانہ لباس میں بنائی تھیں۔ تھوڑی دیر کے
 بعد وہ نوشتہ حاصل کئے جو بطور نذر وہاں رکھے گئے تھے اور انکی تاریخ
 تحریر نوین اور دسویں صدی مسیحی تھی چونکہ یہ نقاشیاں بہت با ایک

اور نازک ریشمی کپڑوں پر کر کے انھیں بہت سخت لپیٹا گیا تھا اسلئے ان کپڑوں کی تھیں کھوٹا بہت مشکل تھا جو پانچ چھ فیٹ لمبے تھے۔ کیونکہ جہان پر شکنین پڑ گئی تھیں وہاں سے پھٹ جانے کا بہت احتمال تھا جس سے مین ڈرتا تھا۔

خوش قسمتی سے مین نے دیکھا کہ وہ بچاری ان نفیس اور عمدہ رنگ کی یادگار چیزوں کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ مین نے موقع پا کر بہترین تصویریں الگ رکھ لیں کہ فرصت میں بغور دیکھوں گا۔ اسکے بعد بھی اُس نے بہت لمبے پروائی کے ساتھ دوسرا بستہ مہین دیدیا گویا کہ وہ بیکار چیزیں ہیں اور کسی معرفت کی نہیں۔ اسکی یہ لمبے پروائی میرے اطمینان کا قائل کا باعث ہو گئی۔ پہلے بستہ سے مین نے پرانے نوشتوں کی بڑی تعداد ڈھونڈ نکالی جو ہندوستان کی ایک قدیم زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ پہلے روز صبح سے رات تک میں اور جیانگ سو یہ برابر محنت کرتے اور ہندی کے متفرق اوراق کو جمع کرتے رہے۔ یہ اوراق چینی اور تبتی زبان کے نوشتوں میں (اور وسط ایشیا کی زبان میں لکھی ہوئی چینی مذہب کی ترجمہ اور تفسیر کی کتابوں میں) مخلوط تھے۔ روزانہ تفتیش امدان و لحاظ چیزوں کی تفصیل جو اُس کاوش سے حاصل ہوئیں یہاں نہیں لکھ سکتا۔

خصوصاً وہ بستی بہت دلچسپ تھے جو کتابخانہ، منقش کپڑوں، اور انواع و اقسام کے کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کتب خانہ میں جو سیکڑوں برس تک پوشیدہ رہا تھا صرف جنوبی سمت ہی سے نوشتے جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ دوسرے مقامات کے بھی تھے اسلئے جب ترکی اور بغور زبان کے نوشتے بعض مستون سے برآمد ہوئے تو مجھے کوئی تعجب نہوا۔ کیونکہ بودھ مذہب ملکیت اور بغور میں بہت زیادہ رائج تھا۔ کوک ترکی اور شام کی مخصوص تحریر میں بھی جسے مانی کے پیر استعمال کرتے تھے خطوط ملے۔

چینی زبان کے مختلف نوشتہ ان مشاخطوط و دفاتر وغیرہ سے صرف علمائے ہند و مذہب کی نظم و ترتیب جو ان مقامات پر نوین سے دسویں صدی عیسوی تک جاری تھی ظاہر نہوئی بلکہ ان نوشتوں سے نہیں تاریخ وراج بھی یقین ہو گیا کہ وہ کاغذات سنہ ۱۰۳۹ء (مطابق سنہ ۱۱۳۹ء) کے کچھ زمانہ بعد ہی اُس مکان میں رکھے گئے ہیں۔ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دشمنوں کے حملوں کے خون سے یہ نوشتے چھپا دے گئے تھے لیکن مدتوں تک وہ چھپا سا مضبوط غار ذخیرہ خانہ رہا ہے۔ جو چینی استعمال کے بعد بیک خیال کیجاتی اور پھر اسکی ضرورت نہوتی تو وہ اس غار میں جمع کر دی جاتی تھی۔ اس سے ایک سال کے بعد جب اُن چینی

نوشتون کو دیکھا تو بعض نوشتے ایسے ملے جن کی تاریخ تحریر جو بھی صدی
سیحی تک پہنچی ہے۔ چند روز اُن بستون کی نفقش اور بستون
سے مفید چیزیں مثلاً نوشتے، مخصوص نقاشیاں، اور تمام چیزیں حاصل
کرنے میں محنت اٹھانے کے بعد پھر اُن بستون کی طرف متوجہ ہوا جو
چینی کتبوبات سے پُر اور دیوار کی طرح ایک دوسرے پر جم چکے۔ اگرچہ
یہ کام بہت مشکل تھا لیکن آخر کار سب بستون کے نیچے سے چند
گٹھریان ریشمی کپڑوں اور بیش قیمت تصویروں سے معور ڈھونڈے
نکالیں جس سے ہماری نام نہامتون کی تلافی ہو گئی۔

دوران نفقش میں بعض خطوط وسط ایشیا کی برہمنی زبان میں بھی
ڈھونڈے جو چینی نوشتون میں غلط ہو گئے تھے۔ تلافی کے طور پر
بتخانہ کے لئے مقبول ہر بہ دینے کے تعلق میں نے جلد فیصلہ نہ کیا بلکہ عملاً
اُس پجاری کے ساتھ اپنی گفتگو میں طول دیتا رہا اسلئے کہ اس عرصہ
میں شاید وہ میرے مقصد کی طرف مائل ہو جائے۔ جب اس پجاری نے
میری یہ خوش سلوکی دیکھی کہ میں بتخانہ کو چند چاندی کے سکے یا گھوڑے
کے نعل نذر کرنا چاہتا ہوں اور اُس نے خود آبادی کی طرف جا کر اندازہ
کیا کہ اس کا وہ روحانی اقتدار جو عوام کی نظر میں تھا اُس میں کمی نہیں آئی
تو اس نے کچھ یقین ہوا کہ میں کسی اچھے کام میں مشغول ہوں اور بودھ کے

باقی ماندہ علم و صنعت کو اہل مغرب کے مطالعہ کے لئے جمع کرتا ہوں اور اسے
 ابھی طرح سمجھ لیا کہ یہ چیزیں عدم احتیاط کی وجہ سے جلد یا بدیر ضائع
 ہو جائیں گی۔ لیکن مجھے کامل اطمینان اس وقت ہوا جب وہ خزانیہ یعنی
 ۲۴ صندوق پرانی تحریروں کے ساتھ پانچ صندوق تیار و برادر کلاہن کے
 یہ ہوئے کپڑوں کے جو اس فار سے حاصل ہوئے تھے بالکل صحیح
 و سلامت لندن پہنچ گئے۔ غرض یہ کہ اس کام میں ہم نے بہت زیادہ
 محنت اٹھائی تھی نصف ماہ جون کو ان کاموں سے دست بردار ہو کر
 بہت مسرت کے ساتھ اس گرم بیابان میں خبرانی معلومات کے لئے
 مغرب اور وسطا نشان کی طرف روانہ ہوا۔ جو چیزیں حاصل کر چکا تھا
 انھیں قلعہ یا مین میں جو انھسی میں واقع ہے سپرد کر کے پہلے سلسلہ
 کوہستان جنوبی کی طرف جو برف اور آبشاروں سے پر اور سولہ ہو
 ودریائے تونہانگ کے مابین واقع ہے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں
 قریہ چیا و تزو کے قریب چند کھنڈروں کی جھوپڑوں کے دو سلسلوں
 کے درمیان میں واقع ہیں۔ ان آثار قدیمہ سے جو ہمیں حاصل ہوئے
 تھے اور اس دیوار کی حالت جو سخت ہواؤں سے شائع تھی ابھی طرح
 ثابت ہو گیا کہ وہ محصور قریہ بارہویں تیرہویں صدی مسیحی میں آباد
 اور جائے سکونت تھا۔ باوجودیکہ دیواریں استحکم میں پھر بھی جس جگہ پر

ٹے کراتی رہی ہیں بالکل مٹ کر نابود ہو گئی ہیں۔ لیکن شمال و جنوب کی طرف کی دیواریں جن کا طول ہوا کے رخ پر واقع ہوا ہے بالکل سالم بچ گئی ہیں۔

غرض کہ ہر فسانی کو ہستان کے سلسلہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد جو نا نشان کی بلند زمین کے متصل مغرب کی طرف واقع ہے وہاں سے نیچے اتر کر چانگما کے چھوٹے سبز و زار کی طرف گیا اُس کے بعد دریا کو عبور کر کے کوہستانی راہ سے جو بالکل بے آب اور اُس وقت تک غیر معروف تھی بڑی دیوار کے اُس دروازہ کی طرف جواب تک موجود ہے روانہ ہوا۔ یہ دروازہ بہت مشہور اور چبایو کو ان کے نام سے موسوم ہے۔ اس شہر دیوار کی تعمیر بہ نسبت اس دیوار کے جو بیابان تو نہا نگ بین معلوم کی تھی بہت جدید ہے۔ یہ دیوار اس سبب سے بنائی گئی ہے کہ حکومت چین جس وقت اپنے ہمسایوں سے قطع تعلق کرنا چاہیے (جیسا کہ ہمیشہ سے اس کی عادت رہی ہے) تو وسط ایشیا کی بڑی راہ کو اس دیوار کے ذریعہ سے مسدود کر سکے۔

جب ختم جولائی سے پہلے سوچا سے وسط نا نشان کی طرف روانہ ہونا چاہا تو مجھے بہت زحمت ہوئی۔ چین کے لوگ جو سبز و زار کا شومین رہتے ہیں وہ اُس کو ہستان

سے بہت ڈرتے ہیں اور اس جانب کے پہاڑی سلسلون کو
 اُٹھون نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ سوچا کہ حاکم نے جو خیر خواہ
 آدمی تھا چند لوگوں کو ہماری ہمراہی کے لئے مجبور کیا۔ اور وہ
 سب آدمی اور گھوڑے جن کی میں نے اجرت ادا کی تھی صرف اس
 امید پر ہمارے ساتھ ہو گئے کہ ہمیں جلد واپسی پر مجبور کر سکیں گے
 اس سطح وادی تک جو کوہستان ریختوفین اور تولائی شان سے
 درمیان واقع ہے ہمیں رہنا مل گیا۔ اس وادی میں
 جو تیرہ ہزار فیٹ بلند ہے۔ میں نے بعض سوئے
 کانین دیکھیں جن میں اطراف ہسٹنگ کے بہادر آدمی کام کر رہے
 تھے اُس وادی سے روانہ ہونے کے بعد کوئی انسان ہمیں نظر نہ آیا
 یہاں تک کہ آخر ماہ میں منگولیا کے چند باشندے کا پنجو کی جنوب
 دیواروں میں مویشی چراتے ہوئے ملے۔ وہاں کی بہترین چراگاہیں
 ہمارے تھکے ہوئے جانوروں کے لئے نعمت عظیم تھیں جنھوں نے ہمیں
 زیادہ نقصان سے بچالیا یہ چراگاہیں گیارہ ہزار فیٹ سے تیرہ ہزار فیٹ
 تک بلند تھیں چونکہ ان چار سلسلہ کوہ کے مقابل جن میں کہن شان
 واقع ہے کوئی چیز حائل نہ تھی اور ان کے بیچ میں بہت وسیع اور کشادہ
 وادیاں تھیں اسلئے جغرافیہ ملاحظوں میں بہت آسانی ہوئی اور پھر کچھ رہنا

کی چند ان ضرورت نہ رہی۔ ہماری فطرتی تکلیفوں میں جو ایسے وحشت انگیز مقامات کا خاصہ ہے (چینی مزدوروں کی کمزوری کی وجہ سے یا الفاظ دیگر ان کے محل میں مشاق نہونے کی وجہ سے) بہت اضافہ ہو گیا۔ وہ ان کو ہنادن کو خطروں سے سمور بستھتے تھے اگرچہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ عقل کے اس حصے سے کام لیتے جو ایفون کھانے کے بعد ان کے لئے بچ گیا ہے اور کسی قسم کے خوف و خطر کی پروا نہ کرتے برعکس اس کے فباسی باوائی خطروں سے بچنے کی وہ بہت تدبیریں کرتے تھے اور بار بار انکی ہکوشش تھی کہ وہ کسی طرح بھاگ جائیں اور ہین محل و نقل کیلئے حیران و پریشان چھوڑ دیں۔ لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہماری تدبیروں میں خلل آنے سے پہلے وہ اس خیال سے باز آ گئے۔

خلاصہ یہ کہ روانہ ہونے کے بعد چار سو میل سے زیادہ راہ طے کر کے ہم نے ماہ اگست میں شمالی نا نشان کے کوہستان کی تینوں قطاروں کا معائنہ کر لیا جو ۱۹ ہزار فٹ تک بلند اور برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس مہیب اور برفستانی پہاڑوں کے سلسلہ کو (جو سولہ ہونے کے پانی کو غارہ نور و کو کو نور نامی آبشاروں سے تقسیم کرتا ہے) شمالی جانب سے معائنہ کر کے معلوم کیا کہ اسکی چوٹیاں شمالی کوہستان کی چوٹیوں سے بہت زیادہ بلند ہیں۔

بلند زمینوں کے بعد جہان کہ ہر جگہ تالاب ہیں منبع دریا سے تا آنگ
 کی طرف روانہ ہوا جس کا پانی ہونگہو کے پانی میں مل جاتا ہے۔ اور وہیں
 دریا سے چین کا آبشار بھی دیکھا۔ وہاں سے پھر دریا کے کالجھو کی بالاٹی
 وادی پر پہونچ کر کوہستان ریختونین سے گزرا۔ رام سنگھ کے پاس پیمائش
 کا آلہ تھلاؤں آلہ کے ذریعہ سے مین نے فریٹا انھسی اور کالجھو کے درمیان تمام
 زمینیں معائنہ کیں جن کا رقبہ ۲۴۰۰۰ مربع میل تھا۔ شروع ستمبر میں کالجھو
 سے طولانی سفر کیلئے روانہ ہوا یہ قصد تھا کہ دوبارہ دریا سے تارم کی پین
 پر ملپ کر جاڑ وکی ایک نعل پھر وہاں کی تحقیقات میں صرف کروں۔
 اس سفر میں بعض علمی و عملی ملاحظات کی وجہ سے مجبور ہوا کہ ہامی ترخان
 کی راہ سے قافلہ کی اس بڑی گزرگاہ پر پہونچ کر سفر کروں جو ساتویں
 صدی مسیحی میں لوپنور کی قدیم راہ کے بجائے استعمال ہوتی تھی۔
 اسے رام سنگھ جس نے ان شان میں بہت نمایاں خدمتیں کی تھیں۔
 ہندوستان کی واپسی کیلئے مجھ سے جدا ہوا کیونکہ اسکی صحت اتنی بہتر
 نہ تھی جو وہ جاڑ وں کی ایک اور فصل کی زحمتمیں اٹھا سکتا۔ اسے لال سنگھ
 نے اسکی جگہ لی اس آدمی نے بہت تکلیفوں کے موقعوں پر اپنی جفرانی
 قابلیت اور فوق العادت ہمت سے کام لیا۔ کیونکہ اس سے قبل کبھی مرتبہ
 ایسے قافلہ کے ساتھ ہمیں سے مشرقی چین تک جا کر امتحان میں بورا

اُتر آھا۔ اس طولانی سفر کی پوری تشریح یہاں نہیں کر سکتا جو آغاز اکتوبر ۱۹۴۵ء (مطابق ۱۳۲۵ھ) سے شروع ہوا۔ انھنسی سے قرہ شہر تک (جو راضی دریا سے تارم کے شمال و مشرق میں واقع ہے) قریباً نو سو میل کی مسافت میں نے دو ماہ میں طے کی۔ تائین شان اور پائین شان کے مابین اس پتھر پلے ویران بیابان میں جتا بادی و سبزہ زار نظر آئے وہ ہامی و ترخان ہیں اس مقام پر باوجودیکہ بعض آثار قدیمہ کے تحقیقات و ملاحظات ممکن نہ تھے پھر بھی کانوں کے کھنڈروں کا کچھ حصہ میں نے دیکھا اس سے جو کچھ فائدہ حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ صوبہ تائین شان اور اسکے اطراف کے ملاحظہ کیلئے اچھا موقع ہا تھا آگیا۔ ۱۹ غازیماہ دسمبر میں جس وقت ہم قرہ شہر میں پہنچے فوراً زمین کھودنے اور تفتیش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بتخانہ ہائے بودھ کے کھنڈروں میں جو قرہ شہر سے ایک منزل کے فاصلہ پر مغربی جانب واقع ہے۔ ہم ایک انتظام اور مخصوص ترتیب کیساتھ زمین کھودنے لگے۔ یہ بتخانے اگرچہ بعض جھوٹے اور بعض بڑے ہیں لیکن سب ایک خط پر اور ایک ہی وضع کے الگ الگ بتائے گئے ہیں۔ اسلئے ہمارے مزدوروں کے کام میں بہت سہولت ہو گئی ان بتخانوں کو مان کے سلمان میں گوئی یعنی نہراخانہ کہتے ہیں اور یہ پتھر کے دامن میں واقع ہیں۔

یہ ظاہر تھا کہ ان بتخانوں کو قحط شدید بارش ہی نے نقصان نہیں پہنچایا ہے بلکہ آگ لگ جانے سے بھی انھیں پورا نقصان پہنچا ہے اور جب مین نے بعض سکے ایسے بائے خلی تارنج نوین صدی مسیحی تک پہنچتی تھی تو گمان ہوا کہ یہ آتش زدگی مسلمانوں کے ابتدائے اخت و تاراج کے زمانہ میں ہوئی ہوگی۔ باوجود ان سب خرابیوں کے جو ہوا کی ناموسا اور بت برستی کے ساتھ تھب کی وجہ سے وہاں پیدا ہوئے پھر بھی ہمنے اشیائے قدیمہ بہت زیادہ حاصل کیں۔ بڑے بتخانہ مین سے منقش کچ کے تختے بہت ملے جو دیواروں کی زینت کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ اور بعض بتخانوں کے اطراف کے دالانوں سے بھی ہم نے چند منقوش تختے ڈھونڈے جو خاک کے نیچے آگ اور رطوبت سے محفوظ رہ گئے تھے۔

صیقل کی ہوئی منقش چیزوں سے جو پہلے مطلقاً کھین ظاہر ہوا کہ یہ بتخانہ بہت زیادہ آراستہ کیا گیا تھا۔ ان تصویروں کی وضع سے معلوم ہوا کہ بودیونان کی صنعت نقاشی شمالی و مغربی ہند کی اتہاس سے یہاں پہنچی ہے۔ پندرہ دن کا زمانہ جو مین نے مین گوئی مین بسر کیا اس عرصہ میں سردی کی شدت سے ہمنے بہت زحمت اٹھائی۔ کیونکہ ہوا حالت انجماد سے بھی ۴۲ درجہ زیادہ سرد تھی۔ سب سے بڑا بہت سرد کمر تھی جو نرگزن اش سے اٹھکر ہر طرف چھا گئی تھی کئی روز تک یہی حال رہا۔ جب وہاں ہمارے

سب کام ختم ہو گئے تو ہم عید سیچی (کرسمس) کے قریب وہاں سے کوہستان غزو
 کی طرف گئے اور ہم لوگ وہاں کسی قدر آسودہ ہوئے۔ یہ کوہستان بھی اگرچہ
 سرد ہے لیکن دھوپ خوب رہتی ہے۔ وہاں کم سخن گڑریوں نے زحمت
 اٹھا کر ہمیں جو اطلاعات ہم پہنچائیں ان کے ذریعہ سے ہم نے بودھ کے
 زمانہ کی بعض یادگارین معلوم کر لیں جنہیں اس وقت تک کسی نے نہ دیکھا تھا
 یہ بتخانے گو چھوٹے تھے لیکن بہت آراستہ اور باوجودیکہ ہر طرف آبادی
 بہت دور واقع ہوئے تھے لیکن پھر بھی بہت شکون کے حلون سے محفوظ
 نہیں رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مشاء کے ابتدائی دن میں اس رگستان
 کی شمالی و مشرقی انتہا پر کورلہ میں ہم پہنچ گئے اور بہت خوش ہوئے کہ دوبارہ
 پھر اُس مقام پر مراجعت کی وہاں سے دریائے انجک کی طرف جو جنوبی
 سمت میں واقع ہے روانہ ہوئے۔ میں نے اور لال سنگہ نے اس سیلابان میں
 جسے اب تک معائنہ نہ کیا تھا الگ الگ ایک ایک راہ اختیار کی لیکن یہ
 دونوں راہیں سبز و زار کو چر میں مل جاتی ہیں جو کاروانی شاہراہ پر واقع ہے
 کو چر میں وہاں کے گھنڈر دیکھنے کیلئے ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ ان گھنڈروں
 میں پانچ سال پہلے جاپانی، جرمنی، اور روسی لوگ آثار قدیمہ کی تفتیش
 کر چکے ہیں آخر کار کچھ عرصہ قبل ایک فرانسیسی شخص پروفیسر لمپٹ اور
 اسکے ہمراہیوں نے ان گھنڈروں کو بالکل صاف کر ڈالا ہے۔ اسکے

بعد میں نے ان حدود کا بجلت معائنہ کیا اور آخراہ بخوری میں پھر اس
 بیابان عظیم کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۹۰۶ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں جب سے
 خن وکریا سے چلا تھا ہمیشہ پرانے کھنڈروں کی تلاش و استفسار میں مصروف
 رہتا تھا۔ ان استفسارات کی وجہ سے معلوم ہوا کہ نکلا میں بعض مکانات کے
 کھنڈر ایسے ہیں جنہیں اس وقت تک کسی نے نہیں دیکھا ہے اس لئے مجھے بہت
 شوق تھا کہ حتی الامکان موسم بہار سے پہلے وہاں پہونچ جاؤں کیونکہ موسم بہار
 میں ہوا اور گرمی کے طوفان کی وجہ سے وہاں کوئی کام کرنا ممکن نہیں اس
 قبل ہمسے کہا گیا تھا کہ شہیار میں راہبر لمبا نیگا لیکن جب ہم وہاں پہونچے
 تو معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل غلط تھی بلکہ کوئی شکاری بھی دریائے کریا سے اس طرف
 نہیں پہونچا ہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ابھی مہین اور زیادہ رہتین
 بیش آئیں گی۔

اس خیال سے کہ دریائے کریا ایک مخصوص مقام تک پہونچتا ہے اور
 وہاں تک پہونچنے کیلئے اگر ڈیڑھ سو میل کی مسافت ریت کے ٹیلوں پر طے
 کی جائے تو ہمیں امید تھی کہ ہم پانی تک پہونچ جائیں گے۔ اور میں تجربہ کیوجہ
 یہ سمجھتا تھا کہ اس رگستان کو عبور کرنے کے لئے جہاں قطب نما کے سوا کوئی
 رہنما بھی نہیں کس قدر مشکلیں پیش آئیں گی۔ بہر حال ۲۹ جنوری ۱۹۰۶ء
 (مطابق ۱۳۲۵ھ) کو گلہ بان کے آخری مکان سے جو تارم کے قریب تھا

روانہ ہوا۔ باشندگان شہار سے ۸ نفر مزدور کنواں کھودنے کیلئے اور ۴ دن کی اجناس خوراک جو ۲۰ نفر اہل قافلہ کیلئے کافی ہوں ہمراہ لیں۔ پندرہ اونٹ جو ہمارے ساتھ تھے ان پر صرف پنج (پنچ) بار کی تھی باوجودیکہ ہر شخص کو پیدل چلنا ضروری تھا پھر بھی میں نے مجھوڑا چار ٹوٹیلے کہ بچھے اور میرے مٹیوں کو دریا عبور کرنے وقت تکلیف نہ ہو۔

آٹھ روز ریت کے ٹیلوں پر سفر کر نیلے بعد جنہیں سے بعض سو فیٹ بلند تھے ہم ایک خشک دلدل کے شمالی کنارے پر پہنچے۔ یہ خشک دلدل دریا سے سو یا کی وجہ سے بن گئی تھی اور دریا کے کناروں کی طرح خشک نظر آتی تھی۔ بعض مقامات پر نصف ریت کے نیچے اور بعض جگہ بالکل جنگلون کے جھنڈ میں پوشیدہ ہو جاتی تھی۔ یہاں ہماری زحمتیں حد سے بڑھیں کیونکہ ہماری حالت اس شخص کے مشابہ تھی جو دریا سے گزر کر بے پائان دلدل میں پھنسا ہوا اور بے راہ نما کے حیران ہو۔

بہر حال ہماری نجات اس خشک ریا کا کنارہ ڈھونڈھنے پر منحصر تھی کیونکہ ہمیں امید تھی کہ ہم اسکی ریت کے نیچے سے پانی حاصل کر سکیں گے۔ چنے ریت کے ٹیلوں سے گزر کر اس خشک دلدل میں زمین کھود کر کسی قدر پانی حاصل کیا۔ ہمیں امید تھی کہ ہماری قسمت مددگار اور نصیب سازگار ہے یہاں سے ہم آسانی کے ساتھ آگے جاسکیں گے لیکن

تھوڑی دیر کے بعد یہ امید یاس و حرمان سے بدل گئی۔ بمقدور ہم آگے
 بڑھے اسقدر اس خشک دریا کا کنارہ ڈھوٹتے تھے میں زیادہ کوشش کی
 لیکن بہت کم پایا کیونکہ خشک جنگلون اور ریت کے نو دون میں ایسی
 چھپ گئی تھی کہ اس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اپنی تمام
 مین اپنی حشت خیز زمین نہیں دیکھی۔ کنواں کھودنے اور پانی حاصل کرنے
 سے ہم بالکل ناامید ہو گئے۔ لال سنگہ، ابراہیم بیگ، اور جیوت سنگہ کے
 سوا ہمارے تمام ہمراہیوں نے ہمت ہار دی ان کے علاوہ حسن اخوند ساربان
 نے بھی کمال مردانگی کے ساتھ کسی خوف کا اظہار نہ کیا۔ باجی روز اسی
 صہیت میں گزرے اور اہل شہیار کی بقراری بہت خوفناک ہو گئی وہ لوگ
 بار بار بھاگ جانے کا قصد کرتے تھے لیکن اس بھاگنے کا نتیجہ موت کے سوا
 اور کچھ نہوتا۔ چھٹے روز میں اور لال سنگہ جعفرانی ملاحظین میں مشغول ہونا
 چاہتے تھے کہ تین سو فیٹ بلند ریت کے ٹیلے پر سے اس نامحدود بیابان
 میں چند سفید خطوط بہت دور نظر آئے جب یہ سافت طے کرنے کے بعد
 وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سفید لکیریں شورہ زار کے نمک کے نہیں ہیں بلکہ
 دریا کا پانی جم کر برف کے ٹکڑے بن گیا ہے۔ اس وقت مجھے جس قدر خوشی
 ہوئی اسکا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہمارے اونٹوں نے دو ہفتہ سے اور
 گھوڑوں نے چار روز سے بالکل پانی نہیں پیا تھا اور ہم لوگوں میں سے بھی

ہر ایک کو روزانہ تقریباً ۲۴ تولہ بانی تقسیم ہوتا تھا۔ یہ غیر مستقل نہر اب ریگزاروں کے درمیان میں ایک نئی گزرگاہ بن گئی ہے اور اس مقام سے بہت فاصلہ پر واقع ہے جہاں سے میں چار سال پہلے گزرا تھا۔ چند دن کے بعد ایک سرسبز جنگل میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں نئی راہ قدیم گزرگاہ سے جدا ہوتی ہے۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد میں پھر قرہ دانگ کے کھنڈروں کی تفتیش میں مشغول ہو گیا۔ چند صدی کے بعد نہر کا بانی اپنا رخ بدل کر پھر ان کھنڈروں کے قریب بننے لگا ہے۔

سال ۱۹۰۷ء میں جب میں یہاں آیا تھا تو ریت اور ہوا کے طوفان کی وجہ سے انکی پوری تفتیش نہ کر سکا تھا لیکن اب ہوانے ریت کو ہٹا دیا ہے اور کھنڈر اچھی طرح ظاہر ہو گئے ہیں۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ پہلی صدی مسیحی میں سرحدی فوج کی چھاؤنی کے علاوہ کسانوں کی ایک آبادی بھی اس بیابان میں تھی۔ دریائے کرای کے قریب ختن کے چند لوگ جو خزانہ ڈھونڈ رہے تھے رہنا۔ کئے طور پر یہیں مل گئے اور ہم ان لوگوں کے ساتھ اس بیابان کی طرف روانہ ہوئے جو سنہ ۱۹۰۷ء میں واقع ہے۔ ختن کے لوگوں نے اس ریگستانی بیابان میں تخیل و دھ کے چند کھنڈر ڈھونڈ رکھے تھے جنہیں میں نے پہلے سفر میں نہ دیکھا تھا۔ اگرچہ ان کھنڈروں میں (جو ایک گانوں کے قریب واقع ہیں اور وہ گانوں ساٹھ سال قبل تک آباد تھا)

کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی پھر بھی ہمارے کوششیں بے ثمر نہ رہیں کیونکہ
 میں نے بعض مفید چیزیں ڈھونڈ لیں مثلاً ہندی زبان کے نوشتے تصویروں
 زمانہ بودہ کے منقش تختے۔ معلوم ہوا کہ یہ کھنڈر بھی آٹھویں صدی سہی
 سے ویران ہیں۔ میں نے مارچ اور اپریل کے مہینے اس بیابان میں دو موکو
 اور ختن کے کنارے بسر کئے۔ ہم نے جو مکانات ملاحظہ کئے ان میں منجملہ
 ایک بڑا بتخانہ بھی تھا جس کی نقاشی بہت دقیق تھی اور وہ بالکل ریت
 میں چھپا ہوا تھا اگر ہمارے تحقیقات کی وجہ سے دریا سے یوزکاش و قراش
 کے درمیانی بیابان میں نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بتخانہ بھی بتخانہ راک
 استوپا کی طرح جسے میں نے ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں دریافت کیا تھا۔
 حضرت عیسیٰ سے تھوڑے زمانہ بعد کا ہے۔ اس کے بعد بیابان کی راہ سے
 ختن کے خشک دریا کے کنارے شمال کی طرف اسکو کا ارادہ کیا۔
 اتنا سے راہ میں ایک قلعہ کے کھنڈر دیکھے جو راہ کی حفاظت کیلئے بنایا
 گیا تھا۔ یہ قلعہ اس بیابان میں کوہ مرزاغ کی چوٹی پر ختن کے بائیں جانب
 واقع ہے۔ اگرچہ خود قلعہ آتشزدگی کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا لیکن کوڑے
 کا ایک ڈھیر باقی تھا جسے وہاں کے رہنے والوں نے باہر پھینک دیا
 تھا۔ تین روز تک برابر اس کوڑے کے کرکٹ میچ پیش کر کے ہم نے کسی زبانوں
 کے بہت زیادہ نوشتے حاصل کیے جو تختوں پر اور کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے

انکی تاریخ تحریر نوین صدی سچی سے قبل کی تھی۔ غرضکہ ہم شروع میں زیادہ زحمات کے بعد آکسو پہنچ گئے۔ وہاں لال سنگ کو جزائی ملاحظات کو مہمان تائین شان کے اطراف سے کاشغر کے شمالی درون تک، کیلئے امداد کی ضرورت تھی۔ ہم نے اپنے قدیم دوست یانتا جن کی مدد سے وہ سب چیزیں فراہم کر دیں جنکی لال سنگ کو ضرورت تھی۔ اسکے بعد خود میں چند روز اس فرزانہ عالم اور یگانہ دوست کے ہمراہ گزرانے کیلئے وادی ایلج ترخان گیا۔ ایک خوشا سلسلہ کوہ کی راہ کے بعد جو اس وقت تک معائنہ نہوا تھا کلچن کے غیر معروف سبز و زار میں پہنچا۔ اس کو مہمان کی چوٹیاں ۱۲۰۰۰ سے ۱۳۰۰۰ فٹ تک کی بلندی تک پہنچتی ہیں پھر بھی ان پر زیادہ برت نہیں۔ اس تمام کو مہمان میں پانی کی قلت کر غیری گلہ بانوں کی مصیبت کا باعث ہے جو اب تک وہاں نظر آنے تھے۔ باشندگان کلچن کی مفید اطلاعات کے ذریعہ سے کلچن کے خشک کو مہمان اور دریائے کاشغر کی منتہا کے درمیانی وسیع بیابان میں ایک گاؤں کے گھنڈہ دریافت کیے۔ اگرچہ شدید ہواؤں کے اثر سے یقیناً کیلئے کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی پھر بھی ظاہر ہو گیا کہ اس نواح میں آٹھویں صدی سچی تک بہ کثرت گاؤں آباد تھے۔ چنانچہ ان نہروں کی علامتیں اب تک نظر آتی ہیں جو دریائے کاشغر کا پانی ان آبادیوں تک پہنچانی تھیں اور چین کی اس قدیم شاہراہ کا نشان بھی میں نے معلوم کر لیا جو

ان آبادیوں سے کاشتر تک گئی ہے۔
 غرض گرمی کی شدت اور کاموں کی زیادتی کی وجہ سے ختن کی مرادیت
 ضروری ہو گئی چنانچہ دو ہفتہ کے تیز سفر اور شدید و تکلیف دہ ہواؤں کی وجہ سے
 ختن پہونچکر اسی خانہ باغ میں جہاں پہلے ٹھہرا تھا ۷ ہفتہ حاصل کی ہوئی
 چیزوں کے باندھنے میں مصروف رہا۔ یہ کام بہت مشکل اور قابل توجہ تھا۔
 کیونکہ نازکی کے علاوہ ان چیزوں کو ایک لمبائی راہ (یعنی رہائے لندن) پر
 درپیش تھی۔ صندوق اور ڈربان بنانے کے لئے چھ دن جو کام کبادہ بہت
 قابل دید تھا اور شاید اس سبزہ زار میں ایسی صندوق تھیلہ سازی نہ کبھی کی ہوگی
 اسی زمانہ میں نایک رام سنگھ واپس آیا جسے میں نے بعض کاموں کیلئے
 میراں بھیجا تھا لیکن انھوں نے اس طرانی سفر میں سچا پڑے کی سہولتیں جاتی
 رہیں۔ جب وہ مجھ سے جدا ہوا ہے تو بالکل صحیح و سالم تھا اور کبھی یہ گمان
 نہ ہوتا تھا کہ اُس پر ایسی افتاد پڑے گی۔ لیکن جب وہ اُن حدود میں انتہائی
 کوشش و مردانگی کے ساتھ اپنے فرائض میں مشغول تھا تو دفعتاً ایک مرض نے
 اُسے نابینا کر دیا۔ میری اس وقت کی پیشانی اور کوششیں جو میں نے اسے
 بار قند اور دہان سے ہندوستان بھیجنے کے لئے کیں وہ ظاہر ہیں اور ان کے
 بیان کی ضرورت نہیں۔ میں نے خود ہندوستان پہونچکر اس با وفاق رفیق
 کی خبر گیری اور تلافی افات میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا یہاں تک

کہ حکومت ہند کی طرف سے اسکے اور اسکی اولاد کے لئے ایک معمولی نفیض مقرر ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ آخر وہ جولائی میں لال سنگھ ہم سے ملا جو کہ وہ اپنے آئینہ سمیت پتھانستان سے کاشغر کیا گیا تھا اسلئے اسکی پامان ہالیان کے خیمائی حصہ کا معائنہ کر سکا جو کوہستان کو نلوں کے شمالی اور خضن کے مغرب میں واقع ہے اور وہاں کا نقشہ بھی کھینچا۔ میں نے اگست کی پہلی تاریخ کو ۵۰ اوترون میں اشیائے قدیمہ اور عکاسی کے شیشے بار کر کے روانہ کر دیے۔ مدہ فر قلم میں ہمارے پہونچنے کے منتظر ہیں اور میں لال سنگھ کے ہمراہ ایک طولانی سفر کے ارادہ سے درباے یوز نکاش کے منبع کی طرف روانہ ہوا اس سے پہلے کہ نفو تاغ میں میں نے جو تجربہ حاصل کئے تھے انکی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ ان عیسوی تنگناؤں سے (جہاں دریا کا پانی مغرب کی طرف بہتا ہے) درباے یوز نکاش کے منبع تک پہونچنا ممکن ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ کوشش کر کے مشرق کی طرف چلیں جہاں سے وہ کوہستان بہت کی مرتفع زمین میں ملجا تا ہے۔

ہماری زحمت اسوقت سے شروع ہوئی جب ہم نے اس تنگنا کی پل سے اُس بلند شمالی سطح کا ارادہ کیا جو ۱۵۰۰۰ فٹ مرتفع اور کوہستان کو نلوں کے متصل واقع ہے۔ وہاں کر یا کے چند لوگ مل گئے جو کوہی

بکریوں کا شکار کر رہے تھے ان میں ایک شخص پاسا نامی تھا جو اگرچہ بہت
 مکار لیکن شجرہ کار بھی تھا اس نے زیادہ اصرار کے بعد آخر کار مہین وہ
 راہ بتائی جو تنگنا سے بور نکاش کی انتہا تک پہونچتی ہے۔ اسکی ہدایت
 کے مطابق ہم لوگ پہلے وادی زلیک میں پہونچے وہاں دامن کوہ میں
 سونے کی کانیں بہت زیادہ کھدی ہوئی تھیں گویا ان میں بہت عرصہ تک
 کام کیا گیا ہے۔ پرانے زمانہ میں اس قسم کے کام بگیا ر سے لئے جاتے تھے
 لیکن اس ناہموار تنگنا سے میں بنی نوع انسان کے بے قیاس ظلم و ستم
 کئے گئے ہیں۔ اگرچہ زلیک کی کانوں میں اسوقت کوئی نہ تھا کیونکہ موسم گرا
 کے چند ماہ تک کوئی نہیں جاسکتا پھر بھی کوشش کر کے ان چند فرد و رول
 سے جو غالباً بگیا ر کے طود پر اس وحشت خیز تنگنا سے میں کام کر رہے تھے۔
 آٹھ چھر حاصل کئے جنہیں اگر وہ نہ دیتے تو ہمیں اپنے مایہ ناز کام کا سامان
 بھی وہیں چھوڑ دینا پڑتا۔ چند بلند درون کو عبور کر کے جو...، اینٹ سے
 ...، اینٹ تک بلند تھے ہم ایک محدود تنگنا سے میں پہونچے اور آخر کار
 منزل راہ طے کر کے نہایت مشقت کے ساتھ اس برف زار میں پہونچے
 جہاں سے دریا کا بڑا حصہ نکلتا ہے۔ جس پگڈنڈی پر ہم چل رہے تھے
 وہ پاک کے دشمنوں کے آمدورفت سے بن گئی تھی اور بعض جگہ اس قدر
 دوشوار گزار تھی کہ قوی اونٹ بھی بار بار اس پر سے گزر نہ سکتے تھے۔ باوجود

گر سین کی فصل گزر گئی تھی پھر بھی اُن نہروں کے کناروں سے گزرنا بہت خطرناک تھا جو اس برف زار سے بہہ رہی تھیں۔ ان سب زحمات کی بادشاہین وہ بلند مقامات مل گئے جو آٹھ سو سال سے ۱۰۰ فٹ تک بلند اور جزائی ملاحظات کیلئے مفید تھے۔ غرضکہ اس طرح دریا کے منبع کی برف زار تک پہنچ کر وہاں سے دریا سے اونٹوں کی متصل زمین پر جو بلند لیکن آسان گزار تھی مشرق کی طرف چلے۔ دریا سے قرہ فاش کی بالائی وادی پر پہنچنے کے لئے ضروری تھا کہ مغربی سمت کے ٹیلوں سے اُس برفستانی سلسلہ پر راہ طے کریں اس خیال پر پہلے پور لانگلا کی راہ سے اُس بلند زمین پر گئے جو ۱۰۰ فٹ بلند ہے وہیں ایک بڑا برف زار ہے جہاں سے دریا کے کر یا نکلتا ہے۔ دریا کے کر یا تک پہنچنے میں اور کئی روز تک اُس کے بعد ناموافق ہوانے ہیں بہت تکلیف پہنچائی کیونکہ دوبارہ برف کا طوفان چاروں طرف چھا گیا اور رطوبت کی وجہ سے زمین جو پتھر کی طرح سخت تھی پھسلنے لگی اور دلدل کی سی حالت ہو گئی یہ حالت ہمارے جانور دن کیلئے بہت زیادہ تکلیف دہ تھی کیونکہ سردی وغیرہ کی تکلیفوں کے علاوہ جسے وہ برداشت کر رہے تھے خوراک بھی انہیں نہیں مل سکتی تھی۔ غرضکہ دریا کے کر یا کے منبع سے گزر کر مغربی سمت کی زمینوں پر جزائی ملاحظات میں مشغول ہو گیا۔ ماورائے سرحد میں دستان

کے جدید نقشے جو شخص ملاحظہ کرے وہ دیکھے گا کہ ان نقشوں میں اس میں
 کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ وہاں میں نے رن سے ملے ہوئی پہاڑوں کی
 چوٹیاں اور وسیع، ادویان بکثرت دیکھیں یہ چوٹیاں اس بڑے کوہستان
 میں لمبائی میں جو منبع پوز نکاش کے پہلو میں واقع ہے۔ نیز چھوٹی چھوٹی
 ندیاں خشک اور دلدلین جن کا اکثر حصہ ۱۵۰۰ سے ۱۶۰۰ فٹ تک بلند
 ہے بکثرت نظر آئیں جو بانی کہ ان وادیوں سے بہتا ہے وہ اُن دریاؤں تک
 نہیں پہنچتا۔ باوجود کہ میں سمیت خبر گیری و احتیاط رکھتا تھا پھر بھی گھاس
 اوچا رہ نہ ملنے کی وجہ سے ہمارے جانور دن کا تھائی حصہ تلف ہو گیا ہم پہلی
 دریا سے ایک منزل دور ہو گئے پھر بھی گھاس نظر نہ آئی بلکہ بانی کیلئے بھی میں
 ضروری تھا کہ ہم زمین کھود کر بانی حاصل کریں۔ راستہ بھر ٹھنڈی ہو رہی
 رہی اور چونکہ آگ جلانے کیلئے کافی لکڑیاں نہیں ملتی تھیں اسلئے وہ ٹھنڈی
 راتیں ہمارے اور ہمارے جانور دن کیلئے دھنیں بھوک کی تکلیف کے علاوہ
 کوئی سایہ دار جگہ بھی ممکن نہ تھی، وبال جان تھیں۔ سب سے بری زمین ہم نے
 اس وقت دیکھی جب ایک کھارسی دریا تک پہنچے۔ اس دریا کے کنارے
 سے شمال و مغرب کی طرف چل کر ایک اور شورہ زار میں پہنچ گئے جان ہر طرف
 نمک سے بھرے ہوئے خشک چھوٹے آتے تھے۔ اس مقام پر اس قدر سناسنا
 چھایا ہوا تھا جو گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ وہاں کوئی جاندار تو کیا پانوں کا

نشان تک تھا۔ سب زیادہ رنجہ واقعہ یہ ہوا کہ میرا بدبختی گھوڑا وہاں مر گیا
 جبکہ میں ترکستان کی سرزمین میں داخل ہوا اسوقت کے برابر اسی گھوڑے پر سوار
 ہوتا تھا۔ اسے سفر کی سختیاں خصوصاً ناکلہا کان کے سفر میں پانی کی قلت بھی
 مجوز کر سکتی تھی۔ ہمنے تین منزل تک یہ دشوار گزار راہ طے کرنے کے بعد اس قہر
 راہ کا نشان ڈھونڈ نکالا یہ چالیس برس قبل سے متروک ہے۔ مسلمانوں کی
 آخری شورش کے ابتدا میں حاجی حبیب سدریس خٹن نے کوشش کی تھی کہ اسی
 راہ سے ہندوستان اور لدخ تک برابر آمد و رفت جاری رہے۔ غلامدہ یہ کہ ہم ۸ ستمبر
 کو عصر کو قوت دریائے قرہ قاش کے مشرقی منبعوں کی ایک وادی میں پہونچے۔
 وہاں قیام کے بعد کراغیری ابدیا کسل جاعتوں کے ساتھ دو دن بسر کئے مین
 جوقت خٹن میں تھا اسوقت ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا کہ یہ لوگ
 یہاں آکر ہمارے قنطر تھے۔ اب صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ حاجی حبیب سدر کی اس
 راہ کا نشان اس مقام تک ڈھونڈ نکالیں جہاں وہ راہ کو نلوں کے سلسلہ کو
 گزر کر نفوٹ کی طرٹ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر و نکا ایک خط جو ایک دوسرے
 پر چنے ہوئے تھے وہاں سے وادی تک چلا گیا تھا مین نے قرینہ سے سمجھا کہ غالباً اس
 سمت کا یہی راستہ ہوگا لیکن اس وادی کے بالائی حصہ میں رخ اور برن کی زیادتی
 نے اس راہ کو بالکل مٹا دیا تھا۔ ہم جس مقام پر پہونچے اسکا پورا پورا تعین شمالی
 جانب سے قدیم نقشہ کی مطابقت میں ضروری تھا اور یہ تعین بے پھاڑ پر

جڑھے ہوئے ٹکڑے تھائے اسلئے میں اور لال سنگہ ۲۲ ستمبر کو چند کرنٹری آدین کے ساتھ
 پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا۔ بہت نشیبی برف زار پر سے جو سب سے قریبی راہ
 معلوم ہوتی تھی ہم روانہ ہوئے۔ ہم کیٹی سیل کی مسانت جہان ہر جگہ ٹڑکی چوٹی
 برف اور اسپرئی برف چھائی ہوئی تھی طے کر کے زحمت اٹھاتے ہوئے پہاڑ کی
 چوٹی پر پہنچے جو تقریباً ۲۰ ہزار فٹ بلند تھی۔ اگرچہ ہوا بہت ٹھنڈی تھی
 یعنی حالت انجمد سے ۱۶ درجہ زیادہ سرد تھی لیکن جغرافی ملاحظات اور نقشہ
 کشی کی وجہ سے جلد واپسی ممکن نہ ہوئی۔ اگرچہ وہی میں رات ہو جائیکے
 خون سے ہم بالکل نہ ٹھہرے پھر بھی جب خیمہ گا، تنگ پہنچے ہیں تو رات
 کا ڈر اٹھ گزہ چکا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے بانو کی
 انگلیوں کو پالا مار گیا ہے اگرچہ یہ بہت رنجہ بات تھی پھر بھی خوش تھا کہ
 جغرافی کام ہماری خواہش کے مطابق انجام پائے گئے۔

چونکہ میں جانتا تھا کہ اس حادثہ کا سخت اور فوری علاج ضروری ہے
 اسلئے ہر طرح اپنے کو داری قرہ قلاش تک پہنچانا لازمی تھا۔ وہاں میں
 نے اپنا قافلہ دیکھا جو اشیائے قدیمہ تیکرہ سلامتی کے ساتھ درہ سنچو سے
 نکل آیا تھا۔ اس قافلہ کو میں نے لال سنگہ کے سپرد کیا جس نے تمام سفر
 میں بے انتہا غیرت اور بہت ظاہر کی تھی اور وہ محنت و تکلیف سے اتنا
 بے پروا تھا کہ میں نے کوئی ہندوستانی ایسا نہیں دیکھا (مجھے بہت

خوشی ہوئی کہ ان زحمتوں کے صلہ میں حکومت ہند کی طرف سے اُسے راجہ بھادری کا خطاب مل گیا، اسکے بعد میں خود ملک دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ باوجودیکہ ۱۸۸۱ء میں فٹ اوپنچے در سے فراہم کی راہ میں تھے اور ساسر کا برون زار بہت دشوار گزار تھا پھر بھی ہم حتی الامکان بہت عجلت کے ساتھ سفر کرتے رہے تو منزل راہ طے کرنے کے بعد پہلے فریہ لداخ میں پہنچے پھر چار دن کے بعد لین وارد ہوئے۔ وہاں جناب شمت صاحب میرے پاؤں کے علاج میں مشغول ہو گئے۔ لیکن میرے سیدھے پاؤں کی تمام انگلیاں کالی جانا ضرور تھا قریباً ۲ ہفتہ تک وہاں قیام کیا یہ زمانہ شمت صاحب اور ان کے رفقا کا محبت سے میرے لئے بہت اچھا گزارا۔ جب میں نے سمجھ لیا کہ اب میں کشتیرانہ ہفتہ کے سفر کا نکل ہو سکتا ہوں تو فوراً روانہ ہو گیا۔ کشمیر میں بھی میرے دوست ڈاکٹر نیو نے یہ صلاح دی کہ میں ایک عرصہ تک آرام کروں۔ آخر کار شروع دسمبر میں کچھ سفر کرنے کے قابل ہوا اور اسی وقت ہندوستان کی طرف چل دیا۔ بعض ضروری کام اور خصوصاً اس دلچسپی کی وجہ سے جو جناب ڈاکٹر نیو نے میرے کاموں کے متعلق رکھتے تھے اور وہ التفات جو میرے ہندوستان مددگاروں کے متعلق تھا ان کی وجہ سے میں آخر دسمبر تک کلکتہ میں رہا۔ پھر وہاں سے سفر کر کے آخراً جنوری میں انگلستان پہنچ گیا۔ اور اگلے سال کہ میرے صندوق بھی تیار ہوئے۔

میں سو اور اشیائے قیمتی سے مالا مال تھے صحیح و سالم لندن آ گئے۔

